زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انھیں کی خاک میں پوشیدہ ہے یہ چنگاری

جنگ آزادی کے

مُسلِم مجاہدِین

حِصہ سوم

از

عزیز الرحمن جامعی لدھیانوی ثم دہلوی

قیمت چھ روپے

غالبؔ کی پریشانیاں اور ۱۸۵۷ء کا المیہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیہ چاکِ گریباں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انھیں کی خاک میں پوشیدہ ہے یہ چنگاری

جنگِ آزادی کے مسلم مجاہدین

حصہ سوم

از

تالیف و تصنیف

عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی ثمہ دہلوی

پتہ:- ۵۲۹۶ کوچہ رحمٰن چاندنی چوک دہلی

بدل اشتراک ۶/- روپے

تفصیل اشاعت

۱۔ کتاب کا نام — جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین

۲۔ تعدادِ طباعت — ۵۰۰

۳۔ قیمت کتاب — ۱۲/= روپے

۴۔ تالیف وتصنیف — عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی

۵۔ پریس کا نام — اعلیٰ پریس، گلی سوداگران، بلیماران دہلی

۶۔ چھپوائی ٹائیٹل — تاج پرنٹنگ پریس، بلیماران دہلی۔

۷۔ ٹائیٹل صفحات — ۱،۲،۳،۴،

۸۔ ملنے کا پتہ۔ — ۵۲۹۶۔ کوچہ رحمٰن۔ چاندنی چوک دہلی ۶
الجمعیۃ بکڈپو۔ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

۹۔ صفحات کتاب علاوہ ٹائیٹل ۲۳۴

۱۰۔ عزیز الرحمٰن لدھیانوی ۵۲۹۶۔ کوچہ رحمٰن۔ چاندنی چوک دہلی نے اعلیٰ پریس گلی سوداگران بلیماران دہلی سے طبع کرا کے ۵۲۹۶ سے مورخہ ۱۵؍ اپریل ۱۹۷۵ء کو شائع کیا۔

فہرست مضامین

انتساب

عزیزم بلال احمد کے نام جس کی جدوجہد کوشش کاوش
اور مشورے کے بعد یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش ہو رہی ہے
برخوردار بلال احمد حضرت عمر بن عبد العزیز کے خاندان کے ہندوستان
میں چشم و چراغ ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ قارئین اس انتساب پر مجھے
اور برخوردار بلال احمد کو دعائے خیر میں یاد رکھیں گے۔

آپ کا

عزیز الرحمٰن لدھیانوی

حرف مکرر

" انھوں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مسودے میں نمبر لگا دیئے۔ انھیں کے نمبر نگ شدہ مسودے کو کاتب نے کتابت کر دیا" میں اس ترتیب سے لاعلم تھا۔ بیماری نے چھ سات سال میرا پیچھا کیا۔ کئی سال تو گھر سے باہر بھی نہ نکل سکا۔ اب جنوری سنہ ۸۵ میں مجھے اللہ کے فضل و کرم سے صحت حاصل ہوئی تو میں زندگی کے معمولات میں شامل ہو گیا۔

۱۰ مارچ سنہ ۸۷ کو میں اس کتاب کی طرف متوجہ ہوا۔ اب جو کتابت میں ترتیب سامنے آئی تو دل بجھ کر رہ گیا اور دماغ ماؤف ہو گیا کہ جن بزرگوں کی خدمت میں نذر عقیدت اس لئے پیش کر رہا تھا کہ عاقبت کا سامان ہو جائے وہی بات اس کتابت شدہ مسودے میں نہ تھی۔ اس لئے قارئین اور اکابرین کے معتقدین اور متوسلین ذیل کی ترتیب کو سامنے رکھیں۔ کتابت ہونے سے پہلے بیمار نہ ہوتا اور مسودات خود کتابت کیلئے دیتا تو اس میں حسب ذیل ترتیب کے ساتھ ان نفوس قدسیہ کا ذکر آتا۔

ترتیب حسب ذیل ہے جو کہ میں نے سن کے اعتبار سے مرتب کی ہے۔

۱۔ دار العلوم دیوبند	قیام	۱۸۶۶ء
۲۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی	جد وجہد کا آغاز	۱۹۰۵ء
۳۔ مولانا عبید اللہ سندھی	"	"
۴۔ مجاہد اکبر مولانا مدنی	"	"
۵ مولانا عبید اللہ سندھی	"	"
۶۔ علامہ منصور انصاری	"	"
۷۔ مولانا ابو الکلام آزاد	"	۱۹۱۰
۸۔ مولانا ابو الکلام آزاد	"	"
۹۔ مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی	"	"

۱۰	مولانا ابوالکلام آزاد	قیام	۱۹۱۰ء
۱۱	رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن	جدوجہد کا آغاز	۱۹۱۴
	لدھیانوی	〃 〃	۱۹۱۴ء
۱۲	ایک عظیم شخصیت مولانا حبیب الرحمٰن	〃 〃	〃
۱۳	رئیس الاحرار مولانا محمد علی	〃 〃	〃
۱۴	حضرت مفتی کفایت اللہ	〃 〃	۱۹۱۸ء
۱۵	سبحان الہند مولانا احمد سعید	〃 〃	〃
۱۶	سید عطاء اللہ شاہ بخاری	〃 〃	۱۹۲۰ء
۱۷	سید عطاء اللہ شاہ بخاری	〃 〃	〃
۱۸	امیر شریعت بخاری	〃 〃	〃
۱۹	حیات اجمل	〃 〃	〃
۲۰	مولانا مظہر الحق	〃 〃	〃
۲۱	تصدق احمد شیروانی	〃 〃	〃

مجھے امید ہے کہ قارئین جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین کو پڑھتے ہوئے میری اس مذکورہ ترتیب کو ذہن میں رکھیں گے اور اب بھی ممکن ہے اگر قاری چاہے تو اسی ترتیب کے ساتھ میری اس کتاب کو پڑھے مجھے بیحد خوشی ہو گی۔

جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین کی زندگیاں چار جلدوں میں مرتب کی ہیں،

یہ مجاہدینِ اسلام مقبول بارگاہِ خیر الانام ہیں اور محبوبِ بارگاہ رب العلمین الرحمٰن الرحیم ہیں ان سب کی زندگیاں انسانیت کیلئے مشعلِ راہ تھیں جو ازل ہی سے فطرت احرار لے کر آئے تھے۔ جن کی ممتاز شخصیتوں میں قلندری و قبا پوشی وضعداری

چھپی ہوئی تھی۔ جن کا مقصدِ حیات آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی۔ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی تھا یہ وہ لوگ تھے جو ہنسی خوشی دار و رسن کو لبیک کہتے تھے جن کے دل میں نورِ ایمانی کی وہ شمع تھی گم کردہ راہوں کو راہ دکھا رہی تھی۔ جہاں یہ لوگ تھے وہاں دار و رسن کی آزمائش تھی۔ یہ تو وہ تھے جن کے لئے کہا گیا ہے اور سچ کہا گیا ہے۔

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں
یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

یہ وہ اللہ کے بندے تھے " زمانہ لیکے جسے آفتاب کرتا ہے۔ ابھی کی خاک میں پوشیدہ ہے یہ چنگاری "۔ کہاں میں اور کہاں ان عاشقان پاک طینت کا تذکرہ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک اس کے باوجود میری روح میں ایک ولولہ مدت سے پوشیدہ چلا آرہا ہے۔

یہ کہ زمانہ ان کو حرف مکرر کی طرح کیوں مٹا رہا ہے اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ قدسیانِ عرشی اور مقام سرمدی میں رہنے والوں کا تذکرہ کر کے نذرانہ عقیدت پیش کروں۔ شاید کہ اللہ کے دربار میں میرا یہ حقیر سا نذرانہ قبول ہو جائے۔ اس ارادے کے ساتھ میں نے ان مجاہدینِ اسلام و وطن کی زندگی کو یکجا و مرتب کیا ہے کیونکہ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے بالخصوص اور ہندوستانی عوام کیلئے بالعموم تاریخ کا یہ وہ بابرکت سرمایہ ہے جس کے پڑھنے سے دلوں میں روشنی، ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور وطن کی جدوجہد میں ثبات قوی کا سبق ملتا ہے۔

جنگ آزادی کے مسلم مجاہد کی تیسری جلد آپ کے سامنے پیش کرتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں میں نے اس کتاب کے مضامین کی ترتیب دی اور ترتیب شدہ مضامین کا مسودہ میں نے اپنے ایک عزیز دوست سے

سے صاف کرایا۔ میرے وہ عزیز ابھی یہ ترتیب شدہ مضامین صاف ہی کر رہے تھے کہ میں اچانک شدید بیمار پڑ گیا۔ اس لئے ترتیب شدہ مسودے میں جن اکابرین کا تذکرہ تھا ان کے مرتبے، مقام، جدوجہد کے آغاز کی تاریخ کو دیکھے بغیر مسودہ کاتب کو دیدیا۔ مسودے کی کتابت جن صاحب نے کی ہے انھوں نے بھی مجھ سے رائے لینے کی ضرورت نہ سمجھی اس طرح اس کتاب میں کسی طرح کی کوئی ترتیب قائم نہ رہ سکی جس کے لئے میں شرمندہ بھی ہوں اور معذرت خواہ بھی
مسودات کے بارے میں میرے صاحبزادے بلند اقبال عزیزم بلال احمد نے یہ مشورہ دیا تھا کہ میں تیسری جلد کو بلا تاخیر شائع کر دوں کیونکہ نفوس قدسیہ اگرچہ گذر چکے ہیں مگر ان کا زمانہ ہمارے زمانے سے متصل ہے۔ موجودہ نسلیں اگرچہ ان نفوس قدسیہ اور مجاہدین وطن کی جدوجہد سے واقف نہیں ہیں مگر گذشتہ انکے نام اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ آج کا نوجوان مجاہدین وطن کی سرگرمیوں اور کارگذاریوں کو پڑھکر ملک و ملت کیلئے سینہ سپر ہو جائے۔ عزیزم بلال احمد کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر دل میں اللہ کا نور اور دماغ میں وطن کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ میں نے بھی عزیزم بلال کی اس تجویز سے اختلاف نہیں کیا۔

اس کتاب میں مضمون لکھنے والوں میں ناز انصاری۔ مولانا عبدالباقی مرحوم مولانا نورالہدیٰ مرحوم اور سی۔ ایل کاوش اور دیگر اہل قلم شامل ہیں۔ اس میں میرے مضامین بھی ہیں۔ ان مضامین کے لکھنے میں میں نے الجمعیۃ اخبار ہفت روزہ پیام مشرق روزنامہ ملک و ملت اور ہفت روزہ پرچم ہند کو سامنے رکھا ہے اور مولانا محمد میاں جو مشہور مورخ ہیں ان کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

عزیز دوست جانباز اور برادرم محترم شورش کاشمیری کے مضامین جو انھوں نے ہفت روزہ چٹان میں لکھے وہ بھی میرے سامنے رہے ہیں۔

میں نے مذکورہ ماخذات کا اس لئے ذکر کرنا ضروری سمجھا تاکہ ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرسکوں اگر ان لوگوں کا شکریہ ادا نہ کرتا یہ ناسپاسی ہوتی بلکہ ایک قسم کا

تاریخی سرقہ ہوتا جسے میں کسی طرح بھی پسند نہیں کرتا ہوں، اس کتاب میں بعض جگہ محررین کے نام آگئے ہیں مگر بعض جگہ میں نام اس لئے نہیں لکھ سکا کہ میرے اصل مسودات مسودہ صاف کرنے والے نے ضائع کر دیئے اور اس نے ان کی کوئی قیمت نہ سمجھی۔ اس کتاب کو پڑھ کر اگر قاری میری توجہ کسی مضمون لکھنے والے کی طرف کرائے گا تو میں قاری کی تجویز کے مطابق بعد تحقیق و تفتیش آئندہ ایڈیشن میں صاحب قلم لوگوں کے نام مضمون کے نیچے لکھ دوں گا۔ مجھ اس سے بڑی خوشی ہوگی۔ یہ تاریخی سرمایہ نہ میرا ہے نہ ان لکھنے والوں کا جنھوں نے اس طرف توجہ کی ہے بلکہ یہ سرمایہ تاریخی قومی امانت ہے۔ جس کو میں قوم کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف۔" ——— عزیز الرحمٰن جامعی

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

ہندوستان اور مسلمان

شخصی وفاداری ملی وفاداری ۔ قومی وفاداری، وطنی وفاداری کا پیکر خاکی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تھے۔ شخصی وفاداری کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ شاید بابائے کانگریس مولانا عبدالقادر قصوری کے بعد پنجاب کانگریس کے صدر ہوتے اگر شخصی وفاداری یا گروہی وفاداری نے انہیں مجلس احرار اسلام سے وابستہ کر دیا ۔ ملی وفاداری ایسی تھی کہ ہندی مسلمانوں کو انہوں نے مجاہدِ وطن کا ہمیشہ قائد بنانا چاہا۔ قومی وفاداری ایسی تھی کہ انگریزی سامراج کو اس نے بھی نگنی کا ناچ نچایا ۔جب مسلمان کے لئے دولت پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی اور وطنی وفاداری ایسی تھی کہ شخصی وفاداریں اور پرانی وابستگیاں کو تقسیم ملک کے بعد قربان کر کے دلی میں آباد ہو گئے۔

مولانا لدھیانہ کے رہنے والے تھے ۔ ایسے عالم دین کی اولاد تھے جنہوں نے انیسویں صدی میں مسلمانوں کا رشتہ کانگریس سے قائم کرنا چاہا تھا۔ جو ہند و جماعت سمجھی جاتی تھی ۔ ان کی کم و بیش ۳۵ سال کی سیاسی قومی زندگی کا گہرا مطالعہ گواہ ہے کہ وہ مجلس خلافت میں ہوں یا مجلس احرار

میں وہ وطن پرور تھے ۔ اور اس زمانے میں چونکہ کانگریس ہی وطن پرور تنظیم سمجھی جاتی تھی اس لئے کانگریس ان کی تحریک ان کا نظریہ ان کی طریق کار تھی۔

مجلس احرار کے لئے مولانا نے اپنی عمر کا عزیز ترین حصہ صرف کیا مجلس احرار کا قیام عجیب حالت میں عمل میں آیا۔ نہرو رپورٹ نے انتخاب جداگانہ اور انتخاب مخلوط کے سوال پر وہ زبردست محاذ قائم کر دیئے تھے۔ انتخاب جداگانہ کے حامیوں کا پلڑا بھاری تھا۔ اور کانگریس کا وہ گروہ جو بعد کو مجلس احرار کا معمار بنا سمجھنے لگا کہ انتخاب مخلوط اور انتخاب جداگانہ کے سوال نے ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ مسلمانوں میں کام کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ اس لئے بیچ کی راہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ ترمیم کی گئی۔ کچھ اضافہ کیا گیا۔ اور بیچ کی جو راہ اختیار کی گئی۔ اس کا نام تھا مجلس احرار اسلام جس کے لیڈر تھے چودھری افضل حق ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ، مولانا مظہر علی اظہر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور شیخ حسام الدین شعراء کرام محبوب کا سراپا لکھتے ہیں۔ ہم شاعر تو نہیں ہیں ، لیکن مجلس احرار اسلام کا سراپا لکھیں تو چودھری افضل حق کو جسم ، مولانا حبیب الرحمان کو دماغ ، مولانا مظہر علی اظہر کو بیخ اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو زبان کہیں گے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ دماغ جس کا نام مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تھا۔ کانگریس سے دور رہ کر مجلس احرار اسلام کے قیام کو مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ مگر وہ جو کہا ہے کہ گروہ سے وابستگی یا شخصی وفاداری ، تو اس کا کیا کیا جائے گا۔

مجلس احرار کے قیام کا ایک دلچسپ پس منظر بھی ہے مجلس خلافت ہی میں ایک پنجابی ٹولی قائم ہو گئی تھی اور جو افراد بعد کو مجلس احرار اسلام کے روح رواں بنے ، وہ پنجابی ٹولی کے بھی روح رواں تھے ، مولانا ظفر علی

کو پنجابی ٹولی (یہ بہ سبیل طنز نہیں ، بہ سبیل واقعہ لکھا گیا ہے) کا روحانی باپ
کہنا چاہیئے۔ مولانا عبدالقادر قصوری بھی اس گروہ کے بزرگ تھے۔ لیکن روحانی
باپ مولانا ظفر علی خاں ہی تھے۔ جن کا قلم ہر طلوع صبح کے ساتھ ایک نئی
سیاست کی تخلیق کرتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی اہمیت یہ بھی تھی کہ مولانا
شوکت علی اور مولانا محمد علی انہیں اپنا حریف سمجھتے تھے۔ حالات کا اتار
چڑھاؤ ایسا تھا۔ کہ مولانا ظفر علی خاں کی گھریلو مجبوریوں نے کچھ بدگمانیاں
کچھ کھچاؤ کچھ تناؤ پیدا کیا۔ اتنے میں کراچی میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ
اجلاس ہوا۔ اور کانگریس کی جو مجلس عاملہ بنی اس کے ایک ممبر ڈاکٹر شیخ محمد
عالم موجود تھے۔ خیال تھا کہ چودھری افضل حق مجلس عاملہ کے ممبر بنیں گے یا
کوئی ایسے صاحب ممبر بنیں گے۔ جنہیں پنجاب کے کانگریسی مسلمانوں کی اکثریت
کی تائید ہوگی۔ یہ واقعہ بہر حال مجلس احرار کا ایک فوری سبب تھا۔ بنیادی
سبب تو یہ تھا کہ پنجاب کا ایک فعال گروہ ہندوستان کی انقلابی جدوجہد میں
ایک خاص انداز سے حصہ لینا چاہتا تھا۔ اور جب وہ اپنی منشا کے مطابق حصہ
نہ لے سکا تو مجلس احرار کا قیام عمل میں آگیا۔

یہ کم و بیش بتیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد مجلس احرار کی سیاست
میں توازن پیدا کرنا۔ اسے افراط و تفریط سے بچانا۔ ہندی مسلمانوں کی بھی
خدمت کرنا اور وطن کی خدمت کرنا۔ مولانا حبیب الرحمٰن کا کام تھا۔ نہایت
نازک مقامات سے مجلس احرار گذری، لیکن چودھری افضل حق کی وفات
کے بعد مجلس کو تلوار کی دھار پر لے چلنا مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا مظہر علی
اظہار کا مخصوص حصہ تھا۔

دنیا جانتی تھی کہ مولانا حبیب الرحمٰن مولوی ہیں۔ پابند شریعت ہیں

لیکن ان کے تعلقات غیر مسلموں سے اتنے وسیع تھے کہ شاید اس دور میں رفیع احمد قدوائی ہی کے ہوں۔ جو مولوی نہیں تھے۔ انقلاب پسند ان کے ارادت مند، دہشت پسند ان کے گرویدہ، کمیونسٹ اور سوشلسٹ ان کے مداح، سکھ ان کے نام لیوا۔ ان کی نجی صحبتوں میں ایسے ایسے لوگ دیکھے جن کی شان نزول معمولاً سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کسی کا مقدمہ سازش ہے۔ کسی کی جائداد قرق ہو رہی ہے۔ کسی کی جوان بہن گھر میں بیٹھی ہے۔ کسی کو جاسوس تنگ کر رہے ہیں۔ کسی کو مقدمہ کی پیروی کے لئے وکیل نہیں ملتا۔ اور تقسیم ملک کے بعد شرنارتھیوں کو مکان نہیں ملتا۔ مولانا حبیب الرحمان سب کی سنتے تھے۔ تسلی دیتے تھے۔ بہت کچھ کرتے ہی تھے۔ ان کی باتیں ہرے زخموں کے لئے بجائے خود مرہم ہوتی تھیں۔

بات یہ نہیں ہے کہ مولانا کے سیاسی حریف نہیں تھے۔ یا خود مولانا ایسے مہاتما یا درویش تھے کہ سیاسی حریف نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن ان کا انداز اس قدر نیاز مندانہ اور مخلصانہ تھا کہ مخالفین ہوئیں بھی تو حد اعتدال میں رہیں۔ تقسیم ملک کے بعد دوران قیام دلی میں بھی سیاسی دیگر سیاسی گروہوں سے اختلاف تو تھے۔ مولانا کے پیچھے کارکنوں اور رضاکاروں کی کوئی فوج نہیں تھی۔ سرمایہ بھی نہیں تھا۔ لیکن کام کرنے کا ایک سلیقہ ضرور تھا۔ کہ جہاں بڑے بڑے لیڈر ناکام رہتے ان کے حصہ میں کامیابی آتی تھی۔ حالانکہ وہ دلی میں گوشہ نشین تھے۔ بس کوچہ رحمان تھا اور ان کا مکان۔ بس طاقی دوڑ مسجد تک تھی۔ مولانا کی سیاست اور طریقہ کار سے سو فیصدی اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ کام کرنے کا ایک ڈھنگ تھے۔

مجلس احرار کی تحریک کشمیر کو بھی تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا بھی اس تحریک کے رہناؤں میں تھے۔ کم و بیش ساٹھ ہزار انسانوں کو انہوں نے جیل بھی بھجوا دیا تھا۔ اس زمانہ میں شیخ عبداللہ کا بڑا نام تھا۔ جموں و کشمیر میں ان کے صرف ایک حریف تھے۔ جن کا نام میر واعظ تھا۔ لیکن وہ بھی برائے نام ہی تھے۔ اس زمانہ میں مولانا نے لاہور کے دو چار ممتاز ایڈیٹروں کے سامنے ایک رائے ظاہر کی تھی۔ اس رائے سے صرف ایک ایڈیٹر نے اتفاق کیا تھا۔ باقی ایڈیٹر سخت بیزار اور برہم تھے۔ اس کے بعد شیخ صاحب کی قیادت نے آسمانوں سے باتیں کیں وہ پنڈت نہرو کے ہمسفر بھی ہوئے۔ ہندوستان سے الحاق کشمیر کی انہوں نے تحریک بھی کی لیکن مولانا نے تیس پینتیس سال پہلے جو رائے ظاہر کی تھی اس پر سختی سے قائم رہے۔ یہ ان کی بصیرت تھی کہ معاملات کے بارے میں وہ برسوں پہلے ایک رائے قائم کر لیتے تھے۔ اور وہ صحیح ثابت ہوتی تھی۔ سیاست دانوں میں ایسی بے خطا بصیرت ہم نے کم ہی دیکھی ہے۔

آزادیٔ کامل کے سوال پر مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو میں جب اختلافات پیدا ہونے لگے۔ تو ۱۹۲۹ء میں مولانا نے پیش گوئی کی تھی کہ گاندھی جی کو یا تو پنڈت جی سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا یا پنڈت نہرو کی قیادت میں ایک متوازی کانگریس قائم ہو گی۔ گاندھی جی نے واقعی پنڈت نہرو سے سمجھوتہ کیا بلکہ رہنمائی کی لگام پنڈت نہرو کے ہاتھوں میں دیدی۔

خاص بات یہ تھی کہ مولانا کی سیاست نئے زمانہ کی سطحی سیاست نہیں تھی۔ بلکہ اس کی خبر میں ان کی روحانیت اور مذہبیت میں پیوست تھیں۔ حالات نے مساعدت نہ کی۔ ورنہ شری اروند گھوش اگر پانڈیچری میں آشرم قائم کر سکتے تھے۔ تو مولانا بھی لدھیانہ، لاہور یا دلی میں ایک روحانی مرکز قائم کر سکتے تھے۔

تو مولانا بھی لدھیانہ۔ لاہور یا دلی میں ایک روحانی مرکز قائم کر سکتے تھے۔ روحانیت یا مذہبیت کو زندگی کا مرکزی نقطہ مان کر ایک نظام کی تشکیل کرنا امام الہند اور شیخ الاسلام کے بعد ہم نے مولانا حبیب الرحمٰن میں دیکھا۔ جب اواخر زندگی میں دلی ان کے لئے کوئی روحانی ماحول پیدا نہ کر سکی۔ تو انہیں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے تسکین ملی۔

تقسیم ملک مولانا کے لئے ایک صبر آزما امتحان تھا۔ ان کا آبائی وطن اگرچہ لدھیانہ تھا۔ لیکن سیاسی اور سماجی وطن لاہور تھا۔ زندگی کے ساتھی لاہور میں تھے جن کے لئے مولانا نے اپنے عزیز ترین مقاصد زندگی میں ترمیم کی تھی۔ ان کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لاہور کو اپنا وطن بنالیتے۔ آخر شیخ حسام الدین امرتسر سے مغربی پاکستان میں منتقل ہو ہی گئے تھے۔ لیکن مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے یہ نہ ہو سکا۔ اور وہ دلی آ گئے۔ ملی جلی زندگی کے جو خواب انہوں نے دیکھے تھے۔ وہ پاکستان میں کیا پورے ہوتے۔ اس خواب کی تعبیر اگر ہو سکتی تھی تو ہندوستان ہی میں ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہ دلی آ گئے۔ اور کوچہ رحمان کے ایک مکان میں رہنے لگے۔ مجلس احرار کے خون کی گرمی ان کی بوڑھی رگوں میں بھی دوڑتی رہی، لیکن اب آزادی کے بعد ترقی و تعمیر کا زمانہ تھا۔ اس لئے گرمی میں ٹھنڈک آنے لگے۔ خون کی گردش امتزاج پانے لگیں۔

حق گو بہت ہیں۔ لیکن مولانا حبیب الرحمٰن کی حق گوئی اپنی مثال آپ تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہوں۔ یا مولانا ابوالکلام آزاد یا ملک خضر حیات خاں ٹوانہ یا سر سکندر حیات یا میاں سر فضل حسین جہاں حق بات کہنے کی ضرورت ہوتی۔ بے تامل کہتے۔ پیری میں ناصح مشفق بن جانا آسان ہے۔ اس لئے کہ سن و سال کا سب ہی احترام کرتے ہیں۔ لیکن مولانا نے بڑے بڑے لیڈروں بڑے

بڑے سرکاری منصب داروں کو اس وقت ٹوکا اور تنبیہ کی جب وہ بوڑھے نہیں تھے۔ اور ان کے مخاطب بھی بوڑھے نہیں تھے۔ مرت سے پہلے منڈت نہرو سے مسلمانوں کے مسائل پر انہوں نے جو بے باکانہ گفتگو کی شاید کوئی کر سکتا۔ اور پنڈت جی نے اپنے روایتی غصہ کے باوجود ان کی باتیں ٹھنڈے دل سے سنیں۔"

ایک بات ہم نے ہمیشہ محسوس کی۔ پنجابیوں کی انفرادیت پسندی کا شاید ہندوستان میں تو جواب نہیں ہے اس حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کے باوجود اور جزوی بنیادی اختلافات کے باوجود احراری دوستوں سے جس طرح برتاؤ کیا۔ وہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ پھر یہ ان کے احراری دوست کوئی ایسے ویسے نہیں تھے۔ اپنے اپنے وقت کے خطیب شہیر، اور دنیا کو تگنی کا ناچ نچانے والے تھے۔ کمال یہ تھا کہ خود مولانا میں غضب کی انفرادیت تھی۔ پھر بھی دوستوں سے ان کی نبھ گئی۔ اور اس کے باوجود نبھ گئی کہ انہیں اپنے ساتھیوں سے اکثر موقعوں پر اختلاف کرنا پڑا اپنے ساتھیوں کا ساتھی اور مخلص نکتہ چین بن کر گذارنا کوئی مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی سے سیکھتا۔

دنیا کا کوئی باپ ایسا ہے، جو اپنے بچوں سے مانوس نہ ہو۔ مولانا بھی اپنے صاحبزادوں سے مانوس تھے۔ ان کے صاحبزادوں کی تربیت بھی ان کے ماحول میں ہوئی۔ مولوی عزیز الرحمن جامعی آج ایک کامیاب مولف اور ایک کامیاب تعلیمی ادارے کے نگراں اول ہیں۔ دوسرے صاحبزادے مولوی خلیل الرحمن ایک اور صاحبزادے جو دیوبندی عالم ہیں پنجاب میں مفید کام کر رہے ہیں ایک صاحب زادے سرکاری محکمہ سے وابستہ ہیں۔ عام طور پر لیڈروں

کا خاندان لیڈر کی موت کے بعد بکھر جاتا ہے۔ یا منتشر ہو جاتا ہے۔ لیکن مولانا کا خاندان ان کے بعد بھی مفید زندگی بسر کر رہا ہے اور جسے دیکھئے وہ مولانا حبیب الرحمن کا جیتا جاگتا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ وہی لب و لہجہ جو مولانا کا تھا وہی انداز بیان جو مولانا کا تھا اور کردار بھی مولانا سے ملتا جلتا ہے۔

مولانا کا انتقال دلی میں ہوا۔ میں لاہور سے مگر ان کا انتقال ہوا جہاں لاکھوں کے مجمع کو بار بار انہوں نے مخاطب کیا۔ جہاں رجعت پسندوں کو غصہ میں بھڑک کر للکارا۔ جہاں باطل کو پیہم شکستیں دیں لاہور یا لدھیانہ میں بھی جانے والے قائد کے قدر دانوں کی کمی نہ تھی۔ لاکھوں ہی تو ہزار ہا ہندو مسلمان اور سکھ ان کے جنازے کے جلوس میں شریک ہوئے۔

ضرورت ہے کہ مولانا کے حکیمانہ خطبوں کی کتابی شکل میں مرتب کیا جائے ان کے لائق فرزند مولانا عزیز الرحمن نے اس پر توجہ کی ہے۔ لیکن زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

ایک عظیم شخصیت

چل بسی

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی
وفات پر

پیغام تعزیت

مرحوم نے مجھے ملاقات کے لئے دہلی آنے کی دعوت دی اس سے قبل مجھ سے مولانا کو کوئی تعارف نہ تھا۔ بجز اس کے کہ انہوں نے محض اخبارات میں میرے چند مقالات پڑھے تھے۔ اس طرح میں نے بھی مولانا مرحوم کے وہ مقالات دیکھے تھے۔ جن میں مصر کی زبردست حمایت کرتے ہوئے ان تمام شبہوں کو دور کیا گیا تھا۔ جو ہندوستان میں بعض لوگوں نے مصر اور مصر کے قائد جمال عبدالناصر کے خلاف مسلمانوں میں پیدا کر دیئے تھے اور بطور مصر و شرق جمال عبدالناصر کے موجودہ اقدام کو زبردست خراج تحسین ادا کیا گیا تھا۔

مولانا مرحوم کی تحریر میں جذبہ ایمانی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ہم ایک دوسرے سے دور تھے لیکن ان مقالات کے ذریعہ ہمارے درمیان ایک رابطہ پیدا ہو گیا۔ مرحوم کے مقالات پڑھنے کے بعد میرے دل میں ملاقات کا شوق بڑھا۔ اسی وقت دہلی حاضر ہونے کا ارادہ کیا لیکن لکھنؤ اور مراد آباد کے سفر درپیش تھے اس لئے یہ ارادہ موخر کر دینا پڑا۔ لکھنؤ کے سفر سے واپسی پر میں فوراً ہی دہلی آیا۔ اور اس مرد مومن سے ملاقات کی جب میں مولانا مرحوم سے ملا تو ایسا محسوس ہوا کہ دو دوست مدت کے بچھڑے ہوئے آپس میں مل رہے ہیں جو زندگی کے مختلف مراحل میں ساتھ رہ چکے ہیں زمانہ کے واقعات سے مولانا مرحوم کے فکر و عمل میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی

بلکہ انہوں نے اپنے تجربات اور فکر و عمل سے ان میں مزید اضافہ کیا۔ اور ہر مسئلے پر قوت ایمانی اور اولو العزمی سے کام لیا۔ مولانا کی قوت گویائی سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک جو نوے سالہ بزرگ ہیں جنکی زندگی کا تابناک حصہ جیل کی اندھیری کوٹھریوں میں گذرا ہے۔ اور جس نے مجاہدین وطن کے ساتھ جہاد حریت میں زبردست حصہ لیا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک نوجوان ہے جس کی رگوں میں جوانی کا خون کھول رہا ہے انہوں نے اپنی گفتگو میں جس جوش کے ساتھ مصر اور مصر کے قائد جمال عبد الناصر کی تائید کی اس سے پہلے کبھی کبھی ان کے کمزور بدن کا خون جوش نکتا تھا۔

مولانا نے بڑے جوش کے ساتھ فرمایا کہ جمال عبد الناصر اس وقت مشرق کو بیدار کر دینے میں جو پارٹ ادا کر رہے ہیں وہ ان کا زبردست کارنامہ ہے۔ مشرقی اقوام کا فرض ہے کہ وہ مصر کے ساتھ مل کر اس کی آزادی اور خود مختاری کیلئے پوری جد و جہد کریں مولانا نے ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان آزادی کا عقیدہ رکھتا ہے اپنی آزادی کے ساتھ دوسروں کی چاہتا ہے۔ اس لئے وہ مصر کے اس باعزت اقدام کا زبردست حامی ہے۔

مولانا نے ایسے لوگوں پر بڑے افسوس کا اظہار کیا جو ہندوستان اگر مصر اور اس کے قائد جمال عبد الناصر کے خلاف غلط افواہیں پھیلاتے ہیں اور ان سے مسلمانان ہند کو برا فریفتہ ہیں۔ نیز فرمایا کہ ایسی غلط افواہوں کی تردید اور صحیح حالات سے باخبر کرنے کے لیے مناسب اقدام کی ضرورت کا احساس دلایا۔ نہر سویز پر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے اس طرز عمل پر انتہائی برہمی کا اظہار کیا جو انہوں نے جمال عبد الناصر اور مسئلہ سویز پر اختیار کیا۔

ابو الاعلیٰ مودودی کو جب لاہور کے اس جلسہ میں جو مصر کی تائید کے سلسلہ

میں کیا گیا تھا گیا تو انہوں نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس مرد مجاہد کی زبان سے یہ الفاظ سنکر میں بھی بہت دل برداشت ہوا اور ایسے لوگوں کے طرز عمل پر سخت غصہ آیا جو خود اسلام کے دعویدار ہیں۔ اور دوسروں کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن خود یہ نہیں جانتے کہ جو لوگ اس وقت مصر کے ساتھ تعاون کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ جو مغرب کے نظام کا شکار ہو رہا ہے اور مغربی ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے۔ ان کے بارے میں اسلام کیا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ مصر تو ایک اسلامی اور مشرقی ملک ہے۔ اس کے مقابلہ میں مغربی ممالک سے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔

مولانا مرحوم نے ان امور کی طرف بھی توجہ دلائی جو مصری سفارتخانہ کی طرف سے انجام پانے چاہئیں۔ اور جن سے مسلمانان ہند کے دلوں میں بیٹھے ہوئے غلط شبہات دور ہوں۔ اور وہ صحیح صورت حال سے باخبر ہو سکیں۔ یعنی مصری سفارتخانہ کو اردو زبان میں ایسا لٹریچر شائع کرنا چاہیئے۔ جسے ہندوستان کے عوام ہندو مسلم جو انگریزی زبان سے ناواقف ہیں۔ پڑھ سکیں۔ اسی طرح تعلیمی اداروں اور دیہات و قصبات میں بھی لوگوں کو صحیح معلومات بہم پہونچانی چاہیئے۔ مولانا نے اس پر انتہائی تعجب کا اظہار فرمایا کہ امریکہ برطانیہ حتیٰ کہ اسرائیل کی نظر میں اردو دانوں کی اسقدر اہمیت ہے۔ کہ وہ ان کے لئے اردو زبان میں پروپیگنڈہ کرنے کیلئے رسالے اور مختلف قسم کے پمفلٹ وغیرہ شائع کرتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ مصر اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔

اس غیور مرد مجاہد کے خیالات میں میں نے اپنے خیالات سے پوری مطابقت پائی اور مجھے اس نوجوان ہمت بزرگ میں مصر کے لئے زبردست جد و جہد و اخلاص نظر آیا۔ میرے دل میں ان کا احترام و محبت نے جگہ کر لی۔ اور میں نے مولانا

کے وہ خیالات بھی مصر کی زمین میں گھومنے لگے۔ جو انہوں نے اخبارات و رسائل میں کسی مصری کو جتانے کیلئے نہیں۔ بلکہ محض اپنے سچے جذبات کے ماتحت تحریر فرمائے تھے۔ ان میں نہ کسی داد و دہش کی تمنا تھی۔ اور نہ کسی سے داد و تحسین کی خواہش تھی۔

مرحوم نے ہندوستان کے متعلق اظہار خیال فرماتے ہوئے کہا کہ۔ ان کا نظریہ ہے کہ ہندوستان میں تمام لوگ بغیر تفریق مذہب۔ وطنیت صرف اس بنیاد پر کام کریں کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے وطن کی تعمیر کریں۔ مذہبی بنیادوں پر ملکی مسائل کا حل نہ ہو۔ مولانا کی گفتگو اور خیالات میں مجھے ایک پختہ کار اور پر مغز و آزمودہ شخص کی تصویر نظر آرہی تھی۔ اسی پر مغز اور مصر کی رائے تھی کہ ملک کی قسمت صرف اسی صورت میں جاگ سکتی ہے جب کہ مذہبی تفریق کو ملکی مسائل اور باشندگان ملک کے باہمی تعلقات میں دخل نہ ہو۔ کیونکہ ہندوستان میں مذہبی بنیادوں پر متحدہ ہونا ملک کی وحدت کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔ اس طرح سے یہ وحدت اختلافات کی آگ میں ذرے بن کر اڑ جائے گی۔ یا خون کی ندیوں میں بہہ جائیگی۔ اس لئے ہندوستان میں ایک مذہب نہیں ہے۔ بلکہ یہاں مختلف عقائد و خیالات کے لوگ رہتے ہیں۔ ان کے اتحاد میں مذہبی تفریق کا دخل ملک کے لئے خطرناک ہے۔

دوران گفتگو اس جوان ہمت بوڑھے کا جوش بادجود بیماری اور کمزوری کے برابر بڑھ رہا تھا۔ اور وہ جذبہ کے ساتھ کہہ رہے تھے۔ کہ جمال عبدالناصر اسوقت علاوہ سامراجی طاقتوں کے پورا مشرق بلکہ پوری آزادی پسند قوم فخر کر رہی ہے۔ درحقیقت یہ خداوند کریم کی قدرت کا ایک مظہر ہے۔ کہ اس عظیم کام کا بیڑا ایک نوجوان نے اٹھایا ہے۔ جس کی عمر چالیس سال سے زیادہ

نہیں ہے۔

مولانا کے ان پرجوش الفاظ نے مجھ پر گہرا اثر کیا۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ کہ اب مجھے ایک زبردست انسان کی رفاقت حاصل ہو گئی ہے۔

مولانا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ کہ ہمیں مصر کیلئے بہت کچھ کرنا چاہیئے اس کام کو انجام دینے کے لئے ضروری ہے۔ کہ آپ ہر ہفتہ دہلی آئیں۔ تاکہ اس سلسلہ میں مناسب اور ضروری اقدام کیا جائے۔ کیونکہ مسئلہ سوئز صرف مصر ہی کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہر آزادی کا پسند کا مسئلہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اس راہ کا سپاہی بن کر کام کرنا چاہئے۔ اس مجاہد کی یہ باتیں سنکر میرے دل میں انشراح پیدا ہوا۔ اور میرے ذہن میں سکیموں کا ایک لمبا سا خاکہ آیا۔ کہ ہم ایک ساتھ مل کر مصر کیلئے موجودہ حالات میں کس طرح کام کریں۔

کیا خبر تھی کہ۔ موت سامنے کھڑی ہماری گفتگو اور مستقبل کی امیدوں اور پروگراموں کا مذاق اڑا رہی ہے۔ نہیں معلوم تھا کہ۔ اس مرد مجاہد کی ملاقات پہلی بھی اور آخری بھی ہوئی ہے۔ میں تو ایسے مستقبل کا خواب دیکھ رہا تھا جس میں بہت سے اہم اور ضروری کام انجام دینے تھے۔ جدوجہد کا ایک نیا باب شروع کرنا تھا۔ مگر کیا خبر تھی۔ کہ اس خواب پر ایک رات ہی گذرنے پائے گی۔ کہ مولانا حبیب الرحمٰن ہمیں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اس مجاہد جلیل سے ملاقات کا موقعہ عطا فرمائیں گے۔ اور جب اس کی باتوں سے دل کو سرور حاصل ہو گا اور دل میں گہری محبت ہو جائے گی۔ اس وقت کیا ہمیں اس کی یاد میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر اپنے جوار رحمت میں بلائیں گے۔ ایک خزانہ جسے ہم نے حاصل کیا۔ اور فوراً ہی کھو دیا۔ افسوس ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ یہ معلوم نہ تھا۔ کہ یہ دل جس میں آج وطن اور مصر کی محبت اور زندگی کا جذبہ موجزن ہے۔ کل اچانک اس کی حرکتیں بند ہو جائینگی۔

اور ہم آنسو بہاتے رہ جائیں گے۔ اور اس کی جھلک سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو جانا
پڑے گا۔

میں کیا کہوں میرا دل صدمہ سے بیٹھا جا رہا ہے۔ کیا یہ کہوں کہ کاش میں
اس شخص کو نہ جانتا۔ تاکہ آج یہ صدمہ نہ اٹھانا اور نہ اس کی رفاقت سے محروم ہونے کی
نوبت آتی۔ نہیں! یہ ممکن نہیں۔ اس لیئے کہ میں نے اس شخص کے ساتھ بیٹھنے
کی سعادت حاصل کی ہے۔ اس کی ایمان سے بھرپور گفتگو کو سنا ہے۔ اور یہ ایک
ایسی یادگار ہے۔ جو ہمیشہ میرے دل میں محفوظ رہے گی۔ اور میں تازلیست اس
مرد مجاہد کو ہر مجلس میں اور ان قابل یادگار شخصیتوں کیساتھ یاد کرتا رہوں گا۔

اگر میں اس مرد مجاہد کی موت پر رنجیدہ ہوں۔ تو یہ میرے دل کی آواز ہے
کیونکہ ایسی شخصیتوں کی جدائی پر غم سے آنسو بہانا ایک فطری امر ہے۔ خاصکر ان
لوگوں کیلیئے جن کے دلوں میں ایسے مجاہدین کی قدر و قیمت ہے۔

برادر من! ولی پسرانِ مرحوم میں آپ ہی میں کا ایک فرد ہوں۔ اگر آپ سے والد
مرحوم کی تعزیت کروں۔ تو یہ ایک بھائی کی دوسرے بھائی سے تعزیت ہے اس
حادثہ جانکاہ کے احساس میں ہم سب برابر ہیں۔ والد مرحوم نے اپنی پوری زندگی
عزت و خودداری اور ہر دلعزیزی کے ساتھ گذاری اور جدوجہد میں پورا وقت صرف
کیا۔ ان کے حوصلوں اور ارادوں میں ایک لمحہ کیلیئے بھی کمزوری پیدا نہیں ہوتی۔
حتیٰ کہ بیماری میں بھی اور اسوقت بھی جبکہ وہ داعی اجل کو لبیک کہہ رہے تھے۔

آپ کے والد مرحوم نے آپ کے لیئے عمل کی ایک زبردست دولت
چھوڑی ہے۔ اور آپنے ان کے ساتھ رہ کر ان کے طریقہ کار کو بھی دیکھ لیا
ہے۔ اس لیئے آپ کو چاہیئے کہ آپ ان کے سچے جانشین بنیں اور خدا کی راہ میں
اور وطن کے کاموں میں پوری پوری جدوجہد کریں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس نے

اپنے پیچھے آپ جیسے افراد چھوڑے ہوں ۔ اس کی موت موت نہیں ۔
اللہ تعالیٰ ان پر مزید نعمتیں نازل فرمائے ۔ اور ہمیں ملک اور مسلمانوں کو
بہم طلبہ عطا فرمائیں ۔ آمین

غمگین (الشیخ) عبدالمنعم النمر
(حال مقیم دارالعلوم دیوبند)

حضرت امیر شریعتؒ کی پہلی گرفتاری

ڈاکٹر ستیہ پال کا یہ مضمون آج سے ۴۴ برس پہلے کا تحریر کیا ہوا ہے۔ امرتسر کے لئے شاہ صاحب کا دم غنیمت ہے آپ ایک نوجوان باایمان مسلمان ہیں دل میں مذہب وملت اور ملک کے لئے پیار رکھتے ہیں گو کہ سیاسیات میں دلچسپی لیتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن محنت واستقلال سے کافی رسوخ پیدا کر لیا ہے۔ قرآن شریف کے مسائل نہایت خوبی سے بیان فرماتے خواہ ایک مزید صفت ہے۔ بڑے بڑے مجموعوں کو اپنی سحر بیانی سے کر لیتے ہیں ہزاروں آدمی بت بنے بیٹھے رہتے ہیں جب قرآن کی آیات نہایت صحت و درستی کے ساتھ پڑھتے ہیں عالم وجد پیدا کر دیتے ہیں بات بڑی کھری کہتے ہیں لحاظ کسی کا نہیں صاف سناتے ہیں۔ مسئلہ خلافت کے متعلق زبردست تقریریں کرتے ہیں اور اس شہر میں تبلیغ واشاعت کا کام نہایت زور سے انجام دیتے ہیں کام کرنے میں ان تھک ہیں تقریر کرائیے متواتر صبح وشام وعظ کرائیے کیا مجال کہ گھبرا جائیں۔ کاہلی وسستی تو نزدیک نہیں آتی ہر وقت مستعد ہر وقت تیار نہایت سرگرمی ودلی خلوص سے خلافت سودا کے متعلق لوگوں کے اندر صحیح خیالات پیدا کرتے ہیں اور عوام کو خواب گراں سے بیدار کرانے میں پوری سعی فرماتے ہیں۔

مارشل لا کے ایام میں جب سرکار انگریزی کی استبدادانہ پالیسی نے سب کے دلوں پر دہشت پیدا کر رہی تھی اس وقت میں۔

آپ اپنے حجرے سے باہر نکلے اور خوش آواز کو بلند کیا بخوف وخطر آپ میدان میں اتر گئے اور نہایت دلیر و حوصلے سے گورمنٹ ہمیں یہ مضمون عزیز قمر اویس سے ملا ہے جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ چیرہ دستیوں پر کڑی نکتہ چینی شروع کی اور امرتسر میں آپ کی ہر دلعزیزی کی یہ کیفیت تھی کہ آپ اگر کسی مجمع میں تشریف نہ لے جاتے تو وہ جلسہ پھیکا قرار دیا جاتا ہے۔ اور جب آپ جلسہ گاہ میں تشریف لے جاتے ہیں تو اللہ اکبر اور بندے ماترم کے خوشگوار نعروں سے آپ کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

آپ کے بولنے کا ڈھنگ نرالا ہے بیچ بیچ میں قرآن مجید کی آیات رموز دل شعر تو سونے پر سہاگے کا کام دیتے ہیں بچہ بچہ آپ کو جانتا اور آپکے ساتھ پیار کرتا ہے اپنے عجز اور انکساری سے آپنے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ جدھر سے آپ نکل جاتے ہیں لوگ تعاب بجالاتے ہیں اور نہایت محبت سے خوش آمدید کہتے ہیں۔

تمام ہندوستان میں آپ تبلیغی دھوے لگاتے رہے ہیں۔ کبھی کبھی بدایوں کبھی کلکتہ کبھی راولپنڈی کبھی لکھنؤ میں متواتر ریل کا سفر بھی کئی کئی روز کرتے رہتے ہیں پنجاب میں تو شاید ہی کوئی جگہ ہو جہاں آپ تشریف نہ لے گئے ہوں۔

گجرات میں آپنے بہت شاندار کام کیا ہے آپ ہی کی فات سے وہاں ایک قومی درسگاہ نہایت اعلیٰ پیمانے پر چل رہی ہے۔ چندہ جمع کرنے میں خاص مہارت ہے۔ خلافت و ملک کے لئے آپ کی خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔ اور آپ اسی نشے میں ہر وقت سرشار رہتے ہیں۔

خیر الدین کی مسجد میں آج جمعہ کی ادائیگی کیلئے معمول سے زیادہ بھیڑ ہے۔ سخت گرمی کے باوجود لوگ جوق در جوق آ رہے ہیں۔ تمام صحن برآمدے کوٹھے کی چھتیں غرضکہ جتنی بھی جگہ ممکن ہے سب آدمیوں سے پر ہے۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں تمام جگہ کھچا کھچ بھری ہے۔ جو کبھی بھی مسجد میں نہیں آئے وہ بھی آج آئے ہوئے ہیں۔ دھوپ کا وقت ہے شدت کی گرمی ہے جلسہ شروع ہوا مولانا نے قرآن شریف کی ایک آیت کی تشریح شروع کی متواتر ڈیڑھ گھنٹہ مولانا خطاب فرماتے رہے طرز بیان آپ کا اسقدر رقت انگیز ہے کہ حاضرین میں سے کوئی نہ ہوگا جس کے چشم تر نہ ہو گئے ہوں بیان میں تو یہ طاقت ہے کہ رپورٹ لکھنے کے لئے آئے ہوئے مسلمان بھی متاثر ہونے سے بچ نہ سکے۔

ایک عجیب سماں بن گیا اللہ کا گھر اور جمعہ کی نماز اور پھر شاہ جی کا وعظ وہ بھی بہت مدت کے بعد اور پھر مسئلہ خلافت کا درد انگیز بیان بس ایک عجیب رنگ تھا

اس نظارہ کو تحریر میں لانا آسان بات نہیں۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حاضرین میں ایک بجلی سی پیدا ہو گئی۔

وعظ ختم ہو گیا مولانا صاحب بیٹھ گئے اللہ اکبر کے نعروں سے تمام مسجد گونج اٹھی ہر گوشہ سے شاہ صاحب کو مبارک باد ملی۔ ہر ایک کی زبان پر تعریف کے الفاظ ہی الفاظ تھے منت و عاجزی سے بارگاہ الٰہی میں دعا کی گئی کہ وہ خلیفہ کے سابقہ اقتدار کو بحال کرے اور اسلام کی شان کو دوبالا کر دے۔

صبح کے چار بجے ہیں ابھی تڑکا ہے روشنی ذرا ذرا نمودار ہوتی ہے صبح اٹھ کر باہر جانے والے یا دربار صاحب جانے والے اس وقت کہیں کہیں نظر آتے ہیں اور اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اللہ کی یاد میں لگ گئے ہیں۔

نہ معلوم کیا باعث ہے چوک چوک پر پولیس ہے کہیں گھوڑوں پر کہیں پیدل چکر لگا رہے ہیں۔ راستے بند ہیں۔ گاڑی تانگہ یا موٹر والا تلاشی دیئے بغیر گزر نہیں سکتا۔ شہر سے جتنی سڑکیں باہر جاتی ہیں ان پر سنگین پہرہ ہے کیا مجال ہے کہ کوئی شہر سے باہر نکل جائے۔ سیر کو جانے والوں نے یہ سماں دیکھا اور بہت متعجب ہوئے خیال کیا کہ آج ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ یہ سب کچھ بلا وجہ نہیں، ہو سکتا ضرور اسمیں کوئی بھید ہے۔ حکومت کو شاید ڈر ہے کہ مطلوب شخص کہیں فرار نہ ہو جائے۔ اور یہ بھی کہ گرفتاری بھی چپ چاپ ہو جائے۔

یکایک پولیس والوں کو خبر پہنچی کہ کام ہو گیا مطلوب گرفتار ہو گیا۔ بھلا سیاسی یا مذہبی دیوانے کہیں ان باتوں سے گھبراتے ہیں کیا وہ ان زنجیروں سے خائف ہوتے ہیں ان کا تو ایمان ہی بند ہوتا ہے۔

شاہ صاحب اپنی ہمشیرہ کے گھر ان کے فرزند کی شادی کی تقریب میں امرتسر آئے ہوئے تھے لوگوں کے مسلسل تقاضے پر آپ نے جامع مسجد میں وعظ فرمایا اس کو چہ

کے اندگرد زبردست پہرہ ہے جہاں شاہ صاحب مقیم ہیں۔

شاہ صاحب کو نیچے سے کسی نے آواز دی شاہ صاحب نے سوچا یہ چار بجے کون ہے انہوں نے جواب دیا کہ بھئی کون ہے۔ جواب ملا نیچے تشریف لائیے۔ شاہ صاحب سمجھ گئے کہ یہی بلاوا ہے جس کا انہیں انتظار تھا۔ شاہ صاحب نے بہن سے رخصت لی اب میں شاید عرصہ تک واپس نہ آسکوں آپ حوصلہ نہ ہاریں۔ اللہ کی اور رسول کی بلامت و خلیفہ کی حمایت کیلئے اگر مصائب کا کوہ گراں بھی ٹوٹے تو اسے شکریہ کے ساتھ قبول کرنا ہر مومن کا فرض ہے۔

سب انسپکٹر نے کہا آپ فکر نہ کیجئے میں تو آپ کو صرف کوتوال کے پاس لیجانے کے لئے آیا ہوں گرفتاری کا کیا سوال ہے شاہ صاحب نے فرمایا یہ سب لا حاصل ہے یہ آپ اسے سنائیے جو آپ کے ہتھکنڈوں سے ناواقف ہو۔ آپ انہیں ڈرائیے جو گرفتاری سے گھبراتے ہوں۔ چلئے جہاں چاہے چلئے مجھے کسی قسم کا خطرہ نہیں خدا کے اشارے پر میں نے اپنی زندگی کی کشتی اس دریا میں ڈالدی ہے وہ خود ناخدا بن کر اس کو ٹھکانے لگائے گا۔ وہی اس کو تلاطم آلام سے محفوظ رکھے گا۔ اس کی موجودگی میں مجھے کیا اندیشہ نہیں۔

شاہ صاحب کو ہتھکڑی لگادی گئی اور آن کی آن میں پولیس کے ایک دستہ کی حفاظت میں کوتوالی پہنچادیا گیا۔ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں شاہ صاحب کو بند کردیا گیا وہی کوٹھڑی جیسیں چور ڈاکوؤں اور بدمعاش لوگوں کے لئے بنائی گئی تھی خدا کی شان ہے کہ جن کوٹھڑیوں میں سوسائٹی کے بچلے آدمی بند کئے جاتے تھے انہیں کوٹھڑیوں میں آج ملک و قوم پر مٹنے والوں کو بند کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحب جب کوٹھڑی کے اندر داخل ہوئے تو بدبو سے دماغ پھٹنے لگا۔ لیکن کون خیال کرتا ہے پولیس والوں کا دماغ عرش معلی پر ہے۔ اور پھر شاہ صاحب کے ساتھ تو انہیں ایک خاص انس ہے۔ شاہ صاحب

اپنی تقاریر میں ان سے خاص خطاب کیا کرتے تھے۔ اور انہیں بتایا کرتے تھے کہ خوف نہ ہو کچھ آخرت کیلئے بھی توشہ جمع کر لو۔ جب خدا کے سامنے حاضر ہو گے تو کیا جواب دو گے ان پر بڑی لعنت پھٹکار برسایا کرتے تھے اس لئے پولیس والے ان سے بہت تنگ اور بد دل رہا کرتے تھے۔

شاہ صاحب وہیں زمین پر بیٹھ گئے خدا کا شکر ادا کیا جسم کو لاکھ تکلیف ہو مگر روح اپنے ٹھکانے پر قائم ہو تو کوئی آزار آزار نہیں دیتا۔ کیا ہوا اگر خاکی جسم کو زمین پر لیٹنے سے تکلیف ہوتی ہے یہ سب چیزیں عارضی ہیں۔ کوئی کہاں تک تکلیفیں پہنچا سکتا ہے۔ جو اذیت ان سے بن پڑے ڈالیں لیکن شیشۂ ایمان کو ضرب نہ آنے دونگا اپنے فرض کی ادائیگی سے ذرا بھی پس و پیش نہ کرونگا۔

ابھی خیالات میں جھپکی سی آئی کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نورانی چہرہ سامنے ہے بڑی سفید ریش ہے تمام جسم سے جلال کی کرنیں نکل رہی ہیں۔ اس فرشتہ صفت بزرگ نے شاہ صاحب کو جگایا اور کہا کہ بیٹا تمہاری آزمائش شروع ہے۔ تمہارے امتحان کے سامان پیدا کر دیئے ہیں اب تمہاری ثابت قدمی پرکھی جائے گی۔ اپنے بزرگوں کی تاریخ یاد کرو دیکھو تو سہی کتنی بڑی بڑی آزمائشوں میں ان کے محبوب اللہ نے ان کو ڈالا اور ان کی محبت کو بھی دیکھو کہ کس طرح اللہ کی راہ میں ان لوگوں نے اپنے عزیز ترین چیزوں کو نثار کر دیا سنا بس ہتبرک فرض کی ادائیگی کے جرم میں تم آج یہاں بند ہو یہ کام اللہ کو بہت پسند ہے۔ ذرا سی لغزش یکہ کی ذرا سی خواہش تمہیں اور تمہارے مذہب کو رسوا کر سکتی ہے۔ اس بزرگ نے شاہ صاحب کے سر پر ہاتھ رکھا اس کی ایمان کی سلامتی کیلئے دعا کی۔ اور غائب ہو گیا۔

اس پیغام نے شاہ صاحب کے توصلہ میں چار چاند لگا دیئے۔ شاہ صاحب نے اپنے اندر ایک بجلی سی طاقت بھری ہوئی پائی۔ انہوں نے اس پیغام غیبی کیلئے اپنے رب کا شکر

ادا کیا شاہ صاحب نے تلاوت شروع کر دی تمام شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی کہ شاہ صاحب گرفتار ہو گئے

لوگوں نے حسب معمول اللہ اکبر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے نعرے لگائے اتنے میں شاہ صاحب کے کارکن ساتھی بھی پہنچ گئے انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ وہ کوئی شور شغب نہ کریں اور صبر و سکون سے حالات کا مطالعہ کرتے رہیں ۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے پولیس افسر کی اجازت سے چند بزرگ شاہ صاحب سے ملنے کیلئے رہ گئے ۔ انھوں نے دیکھا شاہ صاحب کے چہرے پر رونق تھی جلال تھا بالکل مطمئن و بشاش تھے ، رنج نام کو نہ تھا ۔ اپنی گرفتاری کی ساری داستان اپنی زبان مبارک سے انہوں نے سنائی ۔

ان کے چھوٹے بھائی نے چاہا کہ ضمانت داخل کر دی جائے شاہ صاحب نے جواب دیا نہیں ہرگز نہیں اس حکومت کے ساتھ تعاون کرنا محال ہے ہمارے مذہب کی یہ توہین کرتے ہیں خلیفہ کو انہوں نے معزول کر دیا ہے ۔ حق کہنے والوں کو قید کرتے پاتے ہیں یا ان کے لبوں پر مہریں لگا دی جاتی ہیں ۔ یہ مقدمہ وغیرہ تو ایک بنیادی بات ہے فیصلہ تو گرفتاری سے پہلے ہی کر لیا جاتا ہے ۔ بس مجھے جلد سے جلد اس کا خوگر بن جائے وہ وہ میرا دشمن ہوگا جو میری ضمانت داخل کریگا ۔ ایک دوسرے رشتہ دار نے سوال کیا کہ کیا کوئی قانونی مشیر مقرر کیا جائے ۔

اس پر شاہ صاحب نے ایک قہقہہ لگا کر فرمایا کہ افسوس ہندوستان ابھی تک یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ انگریزی عدالتوں میں انصاف ہوتا ہے ۔ کبھی انصاف کہاں اور اور پھر پولیٹیکل مقدمات میں انصاف ۔ ۔

آپ نے مزید فرمایا مذہب اور ملک کی خدمت کوئی بازیچہ اطفال نہیں سر فروشی کی اگر ہمت نہ ہو تو اس طرف منہ نہ کیجیئے ۔ جانبازی جاں نثاری اور قربانی کا سبق اگر یاد نہ ہو تو اس میدان میں نہ اتریئے ۔

سامعین کے دلوں پر شاہ صاحب کے ان الفاظ نے کسقدر اثر کیا اسکا اندازہ کرنا مشکل ہے ۔ لیکن اسوقت سب کے دل خوش ہو گئے جو قوم شاہ صاحب جیسی ہستیاں پیدا کر سکتی ہے اس کا مستقبل برا نہیں ہو سکتا ۔

شاہ صاحب کو سب نے ایک بار دلی مبارک باد دی اور سب نے خدا کے حضور نہایت عجز سے دعا کی کہ وہ شاہ صاحب کو استقلال دے ہمت دے صبر دے اور طاقت دے ضلع کچہری میں آج پولیس کی بڑی بھیڑ ہے ۔ پولیس کے سپاہی عدالت کے احاطہ میں چپے چپے پر کھڑے ہیں ۔ عوام کا ہجوم بھی آج معمول سے زیادہ ہے ۔

آج شاہ صاحب کا مقدمہ پیش ہونیوالا ہے ۔ چنیدہ چنیدہ اصحاب کو کمرہ عدالت میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی پھر بھی عدالت کے کمرے میں خاصی بھیڑ ہو گئی ہے چند ہی منٹ بعد شاہ صاحب کو پولیس کی حراست میں عدالت میں لایا گیا مقدمہ شروع ہو گیا ۔ عدالت نے شاہ صاحب سے سوال کیا آپ کا وکیل میرا وکیل خدا ہے میرا وکیل رسول ہے جن کی اطاعت کی وجہ سے میں آج اس کٹہرے میں کھڑا ہوں ۔ کوئی انسان میری وکالت کیا کریگا ۔

موقع کے گواہ پیش ہوئے استغاثہ کی گواہیاں سن کر سچے ہندوستانی تو شرم سے ڈوب گئے ہندوستانی کس قدر گر گئے ہیں ، ظالم پیٹ نے انہیں کسقدر ذلیل کر دیا ہے ۔

لیکن شاہ صاحب کا چہرہ بشاش ہے ۔ جب اپنے خلاف بے بنیاد گواہیاں سنتے ہیں تو مسکرا کر کہتے ہیں کہ ہندوستان میں بہت محنت سے کام کرنے کی ضرورت ہے افسوس کہ کسقدر غافل ہیں ۔ کہ روز حساب کیا منہ دکھائیں گے ۔ جرح کرکے کون ان کو جھٹلائے جن مصوموں کے گلوں میں ان لوگوں کی جھوٹی گواہیوں سے پھندا پڑتا ہے وہ جب روز قیامت ان کا دامن پکڑیں گے پھر اس وقت کونسی سرکار کونسی

پولیس کونسے خطاب کونسی جاگیران کی وکالت کریگی۔ اس چند روزہ زندگی کے آرام پر خود فراموش نہ بنو تمہاری نماز تمہارے روزے تمہاری زکوٰۃ تمہارا حج سب کچھ بے سود ہیں سراسر جھوٹ بولتے ہو اور بے گناہ آدمیوں کو بلا وجہ مصائب میں گرفتار کرتے ہو۔ مقدمہ ختم ہوگیا مولانا نے جو خواب وخیال میں کبھی نہ سوچا تھا وہ ان کے سر تھوپ دیا گیا۔ جہاں کی واہی تباہی تھی وہ ان کے ذمہ منڈھ دی گئی عدالت نے سوال کیا کہ کیا کوئی بیان دینا ہے۔ شاہ صاحب نے متانت سے جواب دیا کہ بیان دینے سے کیا فائدہ کون سنے گا پہلے ہی سب باتوں کا فیصلہ ہوچکا ہے تو میرا بیان کیا تبدیلی کرسکے گا۔

میرا بیان یہ ہے کہ اپنے پاک رسول کی پیروی میں یہ فرض ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں قرآن شریف کے احکام کی تعمیل کروں اور ایسا کرنے میں خواہ لاکھ بلاؤں کا سامنا کرنا پڑے اف تک نہ کروں۔

میں خدا کے سامنے کسی اور کو حاکم نہیں مانتا جی کھول کر سزا دیجئے فوراً قید کر دیجئے یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے اپنے دیش میں پردیسی اور پردیسی بھی جانوروں سے بدتر نہ کھانے کو دانہ اور نہ پہننے کو کپڑا ہندوستانیوں سے بڑھ کر اور کسے عذاب ہوگا۔ قید مجھے ذرا بھی ڈر نہیں وہاں طبیعت کو آرام ملے گا۔ آزاد رہ کر اگر ملک وملت کے لیے کچھ نہ کیا تو باعث شرم ہے۔ لیکن جب بے بال و پر ہی ہو گئے تو پھر لاکھ دھتیں پہنچائے ایک بار نہیں سو بار قید خانے میں ڈال دے۔ پھانسی پر لٹکا دے مال اسباب سب ضبط کر لے آنکھوں کے سامنے بچوں کو نیزے سے چھید ڈالے کیا مجال کہ دل پر ذرا سا بھی اثر ہوسکے یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے بس خلافت اور سوراج ہمارا نعرہ اور ہمارا نعرہ ہے مجسٹریٹ نے پولیس کو اشارہ کیا کہ شاہ صاحب کو لے جاؤ دو چار روز بعد حکم سنا دیا جائیگا۔ شاہ صاحب برامدے میں آئے۔۔۔ لوگوں نے اللہ اکبر

کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا شاہ صاحب کا دیدار حاصل کرنے کیلئے ہر شخص ایک دوسرے سے بازی لیجانا چاہتا تھا۔

شاہ صاحب نے نہایت بشاشت سے لوگوں کو سلام کا جواب دیا اور انہیں تاکید فرمائی کہ امن و امان میں خلل واقع نہ ہونے پائے اگر میں قید ہو جاؤں تو غصّے کے جذبات نہ پیدا ہونے دینا۔ مذہب و ملّت کے لئے قید ہونے پر خوشی کا اظہار ہونا چاہئے۔ ہماری نجات جیل کے دروازے سے گزرے بغیر ناممکن ہے۔ لوگ اداس ہو کر گھروں کو لوٹے ایک زبردست طاقت۔ کے سامنے کسی کی کیا پیش چلتی ہے۔ مگر خوشی یہ تھی کہ شاہ صاحب نے عدم تعاون پر پورے طور پر کاربند ہو کر امرتسر کی لاج رکھ لی۔

شاہ صاحب کو تین سال قید کا حکم سنایا گیا اسمیں سے تین ماہ قید تنہائی تھی کتنی سخت سزا ہے۔ تنہائی کے عالم میں انہیں اور زیادہ موقع ملیگا کہ وہ اپنے پروردگار کے زیادہ قریب رہیں۔ شاہ صاحب کے والد بزرگوار نے اس صدمہ کے وقت انتہائی صبر و اطمینان کا اظہار کیا حالانکہ ایک ضعیف باپ کیلئے ایک جوان بیٹے کی اس طرح سزا یابی ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا۔

شاہ صاحب کے گھر والوں کی امداد کیلئے عوام نے کچھ رقم دینی چاہی لیکن ان لوگوں نے صاف انکار کر دیا شاہ صاحب کی اس ذیل مثال سے اور شاہ صاحب کے لواحقین کے قابل تقلید حوصلے سے ہندوستان میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی اور اسمیں دن بدن ترقی ہی ہوتی گئی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

ان کی زندگی کو پیچھے مڑ کر دیکھے تو جیتے ہوئے یوں معلوم ہوتی ہے کہ جیسے ابھی کوئی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور کان ابھی تک جرس کی صدائیں سن رہے ہیں۔

آج سے غالباً بارہ برس پہلے کہ میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور میرا ادبی ذوق ایک محدود معیار سے آگے نہ بڑھا تھا میرے ایک جگری دوست مجھے ایک پبلک جلسہ میں لے گئے۔ جو ہمارے محلہ ہی کے قرب و جوار میں ہو رہا تھا اسوقت تک مجھے سیاسی معاملات کے اتار چڑھاؤ کا کوئی علم نہ تھا صرف اتنا سنا اور پڑھا تھا کہ لالہ زار کشمیر جس کے دامن فردوس میں لالہ و گل کھا بو قلمونی غالب۔ خلد آشیانی کے اس شعر کی نقاش ہے کہ ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اپنے حکمران کے استبداد کی جولان گاہ بنا ہوا ہے اور پنجاب کے مسلمان اس کے خلاف قربانی و ایثار پر کمر بستہ ہو رہے ہیں۔

جلسہ گاہ میں پہنچا تو چاروں طرف ہزاروں انسان ایک ہجوم کی صورت میں جمع تھے اور مکانوں میں پس چلمن عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔

میں بھی اپنے ہمراہی سمیت بیٹھ گیا۔ بیٹھ گیا۔ ایک نوجوان نے اپنے دل گداز لحن میں چند جوش آور شعر سنائے۔ اسوقت تو حافظہ نے ان میں اکثر شعر اپنی یادداشت میں محفوظ کر لئے۔ جب عمر کی نئی رو کے ساتھ ذوق ادبی نے اپنا معیار بدلا اور سیاسی سمجھ بوجھ کا رنگ نکھرا تو وہ شعر حافظہ سے اس طرح محو ہو گئے جیسے کوئی خیال ہی نہ تھا۔

اتنے میں غل ہوا اسیر شریعت زندہ باد نعرہ تکبیر اللہ اکبر نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور فضا میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

دوسری قامت کا رعنا انسان چہرے پر سجاعانہ خندہ ماتھے پر نمایاں سلوٹیں

آنکھوں میں دلکشی سی اور ہاتھ میں ڈنڈا اسوقت تو یہ خیال نہیں تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو قیاس ہوتا ہے کہ قرن اول کے غزوات کا ایک۔ مجاہد تھا جس کو تاریخ نے تیرہ صدیوں کے بعد ایک کروٹ لے کر ہندوستان میں بھیجدیا۔

آپ نے حجازی لحن میں قرآن پاک کی چند آیات پڑھیں اور پھر اپنا بیان شروع کر دیا ابتدا ہی فقروں کی بناوٹ میں گیسوئے فن کی گند معادرت نظر آئی۔ اور جب تقریر اپنے شباب پر پہنچی۔ تو مجمع خطابت کی رو میں بہہ چکا تھا اور ایک ساحر تھا کہ جس نے دلیوں کو مٹھی میں لیکر دماغوں کی کایا پلٹ کر رکھدی۔

چونکہ اسوقت ذوق کا ہی اس قدر تھا۔ اسلئے طبیعت پر شعر خوانی کا اثر نہایت عمیق ہوا جب بھی آپ نے موقع کی مناسبت سے کوئی شعر پڑھا تو مضمون میں جان پیدا ہو گئی۔ پس جلیبن تک زندگی کے آثار ابھرنے لگے۔ اس رات ہی میری زندگی کے ایک سفر کا آغاز بھی ہوا اور احساس ہوا کہ شاعر خندہ ہائے نیم شبی پر ابرق بے اماں ہونیکی تہمت کیوں لگایا کرتے ہیں۔

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تونے لئے خندہ ہائے نیم شبی

۱۹۲۹ء میں جب مجھے احرار میں شریک ہونے کی وجہ سے آپ کے قریبی مطالعہ کا موقع ملا تو میرا نی یاد کا ایک گمشدہ ورق ہاتھ آگیا کہاں وہ زمانہ کہ تماشائی تھے اور کہاں یہ زمانہ کہ خود تماشا بن گئے۔

شاہ جی کی روزمرہ ملاقات سے جو چیز آپ کے ملنے والوں پر نمایاں ہوتی ہے وہ آپ کی بے داغ سیرت ہے اور گلستاں بخارا زندگی آپ کی زندگی میں کوئی اور رفتار میں کوئی فریب نہیں اور مشاہدہ کی کسوٹی پر خالص ہونے کی طرح نکھرتی اور مطالعہ کے افق پر عید کے چاند کی طرح مسکراتے ہیں۔

آپ کو زندگی کی ہر خوبصورت چیز سے محبت ہے اور شاید آپ کے خطابیہ کی خوبصورتی کا سبب بھی یہی ہے آپ میں آن کا شائبہ تک نہیں لیکن آپ کی انفرادیت ہر محفل میں نمایاں رہتی ہے۔ آپ اپنی ذات میں بھی ایک انجمن ہیں اور انجمن آپ کی ذات کے سوا ایک ویرانہ جس میں بھیڑ تو ہوتی ہے لیکن سخن آرائی کا لطف نہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ العالی تو اس حد تک خلوت پسند ہیں کہ انہیں مجلس آرائی کا تصور بھی اپنی طبیعت پر ابتک بوجھ معلوم ہوتا ہے۔

فراغتے دکتا بے وگوشہ

اس کے سوا انہیں ہر صحبت گراں گزرتی ہے لیکن شاہ جی کا معاملہ اس کے بالکل الٹ ہے آپ جب تک مجلس فراہم نہ کرلیں اور اپنے گرد وپیش کی محفل نہ چن لیں آپ کو زندگی مرگھٹ کی شام محسوس ہوتی ہے۔ آپ کے صبح شام ایک جلسہ گاہ ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ ایک عام مجمع ہو اور آپ اس کو اپنی شعلہ بیانی سے مسحور کریں آپ کے لئے گھر کی نشست، ریل کا ڈبہ لاری کی سیٹ مسجد کی صف بازار کی گشت اور جیل خانہ کی چاردیوری یکساں حیثیت رکھتی ہے اپنی بات ہر جگہ کہتے اور بےخوف ہو کر کہتے ہیں۔

کبھی کبھار آپ کو مسلمانوں کے مزارعہ ویراں کا احساس ہوتا ہے۔ تو پہاڑوں کی چوٹیوں، آبشاروں کے نغمے، ہواؤں کی سرسراہٹ دیواروں کی خموشی اور درختوں کے سایوں اور افق کے اس پار نہ جانے کس سے باتوں میں محو ہو جاتے ہیں۔ اسوقت آپ کا چہرہ تمتمایا ہوتا ہے اور ہونٹ کانپا کرتے ہیں۔

آپ کی زندگی کے چار ستون ہیں۔

اسلام پر اعتقاد کا تو یہ عالم ہے کہ اس کے کسی چیز کو چھوڑنے اور بدلنے پر آمادہ نہیں اور معتقدین کے ہر زاویہ خیال سے متفق ہیں البتہ نظر و فکر کا دائرہ لوگوں سے قطعی مختلف ہے، جو حجازی عمارت کی یونانی چوکھٹ ہی کو اپنے تفسیری عقائد کا التزام

زمانہ کی تیز رفتاری پر لگا رہے ہیں۔

آپ کو قرآن مجید کے علاوہ کسی اور کتاب استثنائی حالتوں کے سوا اور خریدنے اور پڑھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے بلکہ آپ کا عقیدہ ہے کہ میرے لیے سب کچھ قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس سے باہر جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے اور ایک باطل شے کیلئے میرے پاس مطالعہ کا وقت ہی نہیں۔

ایک مارکسٹ کو میں نے شاہ جی کا یہ عقیدہ سنایا تو وہ ہنس دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس کو اسٹالن کی سوانح عمری پڑھنے کا اتفاق ہوا تو اسمیں بھی اسی طرز کا ایک واقع منقول تھا۔

اسٹالن کو کسی شخص نے کوئی کتاب پڑھنے کیلئے سفارش کی اس نے جواب دیا کہ میں نے مارکس اور لینین کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ان کا سیاق سباق میرے دماغ میں محفوظ ہے نیز میں نے اپنی زندگی بھی انہی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال لی ہے اور میں ان کا عملی شارح ہوں اگر آپ کی کتاب مارکس اور لینین کی تائید میں ہے تو مجھے اس کی ضرورت نہیں کیونکہ میں خود انھیں سمجھتا ہوں۔ اور کہیں بہتر سمجھتا ہوں اور اگر ان کے خلاف ہے تو پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ میرے نزدیک ان نظریوں کی تردید ناممکن ہے۔ میں نے یہ واقع من وعن دوست کو نقل و عقیدہ پر بحث ہونے لگی۔ اور بالآخر اس کو تسلیم کرنا پڑا کہ عقیدہ انسانی زندگی کا ایک لازم جزو ہے اگرچہ عقیدہ کی تعبیر بھی وہ مادی نکتہ خیال ہی سے کرتا ہے۔

شاہ جی نے پچھلے دو سال مارکس کے معاشی نظریہ پر بھی بے حد غور کیا ہے اور آپ کا یقین ہے کہ اسلام کا اقتصادی ڈھانچہ اس سے کہیں بہتر ہے۔

سوشلزم میں جس چیز کا نام سرمایہ داری ہے آپ کے نزدیک اسلامی کاج میں اسکا تصور ہی نہیں۔ اسلام کی سرمایہ داری رزق حلال اور کسب طیب سے ایک قدم آگے

نہیں اٹھا سکتی اور اس کے انفاق کی بھی اتنی راہیں بنا دی گئی ہیں کہ احتکار و اکتناز کا ہر وہم مٹ جاتا ہے۔ اور اسراف و تبذیر پر ایسے بندھن لگے ہوئے کہ انقاع ہی سرے سے نہیں رہتی۔ اور طبقاتی رفتاری کے ساتھ اس مسئلہ کے ہر ہر پہلو پر اس طرح روشنی ڈالتے اور تمثیلات سے واضح کرتے ہیں کہ قرآن کی یہ عظمت کہ وہ ہر زمانہ کیلئے بے صبح بہار کیطرح نکھارتا ہے۔

حضور سرورِ کائنات کے متعلق آپ کا عشق لافانی اور انتہائی عمیق ہے اور اپنے نسبتی سرمایہ پر فخر بھی کرتے ہیں۔

ایک دفعہ کوئی راز کی بات کہہ رہے تھے لوگوں کو حیرانی ہوئی تو جھٹ سے فرمایا سوچتے کیا ہو یہ حدیث بخاری ہے لوگ رہ گئے اسی طرح ایک مدح صحابہ کے مسئلہ پر لاہور میں تقریر فرما رہے تھے کہ کسی شیعہ دوست نے اعتراض کیا فرمایا میں علی کا بیٹا ہوں صدیق عمر عثمانی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مدح کرتا ہوں تمہیں ان کی قدر و مدح کرنے کا حق کیونکر پہنچتا ہے۔

سچائی آپ کی فطرت میں رچی ہوئی ہے انسان کے ماتھے سے جھوٹ سچ پڑھ لیتے ہیں۔ آپ کو اگر اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک کے متعلق یقین ہو جائے کہ وہ معاملات میں جھوٹ بولتا ہے تو پھر اس کی خیر نہیں ایسا شخص آپ نگاہوں میں ہمیشہ کے لئے اپنا مقام کھو لیتا ہے

زندگی میں بہت سے رہنماؤں سے تعلقات استوار ہوئے کئی ایک عظمتوں کا قرب حاصل ہوا اور جماعتی زندگی کے سفر میں بہت کچھ دیکھا لیکن جن لوگوں کو روپیہ پیسہ کے معاملے میں دیانتدار پایا شاہ جی ان میں سر فہرست ہیں۔

ابھی پچھلے دنوں شملہ میں ایک وزیر سے گفتگو ہوئی تو باتوں باتوں میں شاہ جی کا بھی ذکر آگیا میں نے ان کی فرنگ دشمنی کے متعلق انہیں بتایا کہ انگریز کا دوست ان کا دوست

نہیں ہو سکتا دوستی خیر بڑی چیز ہے اگر کوئی اس قماش کا بڑے سے بڑا آدمی بھی یہ چاہے کہ میں ایک ہاتھ میں آفتاب اور دوسرے میں ماہتاب۔ لیکر ایک ثانیہ کیلئے ان کی نگاہ التفات خرید لوں تو ممکن نہیں۔

افرنگ کی عداوت دراصل آپ کے خون میں گردش کرتی ہے چونکہ آپ سید احمد شہید کے مدرسہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے آپکے دماغ و دل میں انگریز کے متعلق ایک سیکنڈ کے سوویں حصے کے لئے بھی مفاہمانہ تصور نہیں آسکتا۔

آپ نے عنفوان شباب سے آغاز پیری کے ان گنت لیل و نہار اسی مقصد کی جدوجہد میں بسر کردیئے ہیں اور اب بھی آپ کے دن رات مقصد کی آبیاری میں صرف ہو رہے ہیں لیکن تاریخ کا یہ دلچسپ منظر رہے کہ آپ کے بالوں میں سفیدی آگئی اور نو کروڑ مسلمانوں کے دلوں کی سیاہی نہ دھل سکی۔ آپ گو قنوطی نہیں لیکن شاذونادر احساس کی بھی جھلک اٹھتی ہے اور پھر اپنے کوسنے لگتے ہیں کہ ؎

یارب مجھے اس قوم میں کیوں پیدا کیا تھا
جس قوم کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

ایک دفعہ دہلی میں میر احمد حسین شملوی کے مکان پر سب دوست جمع تھے میں نے جامعہ ملیہ دہلی کے اشتمالی رجحانات کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور تشویش ظاہر کی کہ اسطرح بچوں کے اسلامی ذہن کی ابتدائی ساخت کے ڈھے جانیکا اندیشہ ہے۔ تو آپ نے ایک سرد آہ بھری اور فرمایا ؎

برد کہ رونق ایں کارخانہ کم نہ شود
زنق ہمچو منے و زہد ہمچو توئے

خطابت کا سحر تو یکتائے روزگار ہے۔ اردو زبان نے آجتک اتنا بڑا خطیب پیدا نہیں کیا۔ ایک (orator) کیلئے جن قدرتی اور اکتسابی اوصاف کی ضرورت ہوتی

ہے وہ آپ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حاضر جوابی آپ کا شیوہ اور بذلہ سنجی آپ کی لونڈی ہے۔ میرے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا۔ کہ میں مضمون کا انتخاب مجمع کی نگاہوں سے کرتا ہوں اور بولتا ہوں تو میرے الفاظ کی جولاں گاہ ہوتے ہیں۔ حافظہ اس بلا کا پایا ہے کہ فارسی کے ہزاروں شعر از بر ہیں اور جو شعر طفولیت کی سحر میں نظر سے گزرا وہ بڑھاپے کی اس دوپہر میں بھی نہاں خانہ دماغ میں محفوظ ہے۔ اس راہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مولانا آزاد اور آپ کا فارسی ذوق شعر و انتخاب قریب قریب ایک سا ہے اور آپ بھی اپنے سوانح حیات کے بارے میں حضرت مولانا کے ہم آہنگ کہ

ہر کسے دادامن ترہت ا دیگراں بازی

آفتاب الذاختہ آپ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ آپکو عربی و فارسی کے علاوہ ہندوستانی زبانوں کے بہت سے پر عبور ہے پٹنہ میں ابتدائی تعلیم تربیت پانے کے باوجود پنجاب کے بعض ضلعوں کی زبانی لب لہجہ میں بولتے اور ان میں گھنٹوں تقریر کر لیتے ہیں اور اسمیں اتنی شگفتگی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے کہ شراب خانہ ساز بھی لطف نہیں دے سکتی استغنا آپ کی ثانوی فطرت ہے۔ اور اس نے بجز بکر با بن کر بے پروائی کی صورت بھی اختیار کر لی ہے۔ محفل لگی ہو اور شعر و شاعری کا دور چل رہا ہو تو اس سے قطع نظر کہ اہل بزم آداب میکشی کو جانتے بھی ہیں یا نہیں جماعت عاملہ کے اجلاس میں حصہ لیں گے تو پھر بال کی کھال اتارنا بھی لازم ہے معاملات کے ہر رخ پر بحث ہو گی۔

اور جزئیات تک کو چھیڑیں گے پھر یہ سوال نہیں کہ رات تاب کمر آپہنچی ہے یا صبح نے دلانے شب کا گھونگٹ اتار دیا ہے۔ وہ آلتی پالتی مارے خود بھی بیٹھے ہیں اور دوسروں کو بھی جلنے نہیں دیتے۔

مجاہد اکبر

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی

مدظلہ العالی

شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی اندازاً ۱۹ برس کے بعد حج کو تشریف لیجا رہے ہیں جنگ کے زمانہ میں ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء میں حج کو تشریف لے گئے تھے تو میں نے لاہور کے اسٹیشن پر پوچھا کہ خطرہ کے زمانہ میں آپ حج کو تشریف لیجا رہے ہیں آپ نے فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں کوئی خطرہ خطرہ نہیں ہے آپ کی زندگی کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ لکھا جائیگا لیکن حضرت مولانا کی زندگی کے دو مقام ایسے ہیں جن کا جاننا ضروری ہے پہلی بات یہ کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کو مکہ معظمہ میں انگریزوں نے شریف حسین کے ذریعہ گرفتار کیا۔ اور آپ کے ساتھیوں کو بھی گرفتار کیا گیا تو اس موقعہ پر حضرت مدنی مدظلہ پر کوئی مقدمہ نہیں تھا بلکہ شریف حسین کی گورنمنٹ نے کوشش کی کہ آپ مدینہ شریف واپس تشریف لے جائیں لیکن مولانا نے اس موقع پر یہ کوشش فرمائی کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے اور حضرت شیخ الہند کے پاس پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ آپ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے اس کوشش کا نتیجہ کیا تھا پھانسی کا تختہ اور یہ بات آپ کے علم میں تھی کہ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند نے حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء یعنی مولانا عزیز گل صاحب۔ مولانا حکیم نصرت حسین صاحب اور مولانا عبدالوحید صاحب جن کی عمر ان تمام حضرات سے کم تھی پھانسی دینے کا فیصلہ کر لیا ہے حضرت مدنی حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقا کے ساتھ شریک ہو کر ہر قسم کی سزا برداشت کرنے کو تیار ہو گئے مگر آپ کا گرفتار ہونے سے مقصد یہ تھا کہ اپنے شیخ اور بوڑھے استاد کی اس مصیبت کے زمانے میں کچھ خدمت کر سکوں۔ چنانچہ مصر میں یہ تمام قافلہ گرفتار ہو کر پہنچا اور ان سب حضرات کو پھانسی کا حکم ملا مگر چھ دن کے اندر اندر یہ حکم واپس لے لیا گیا۔ اور ان سب حضرات کو مالٹا میں نظر بند کر کے بھیج دیا گیا۔ مولانا چار سال سے زیادہ وہاں رہے چھ ماہ میں قرآن شریف حفظ کر لیا تا کہ رمضان شریف میں اپنے استاد کو سنائیں ساتھیوں کے لئے کھانا پکایا اور حضرت شیخ الہند کی ہر وہ خدمت کی جو ایک شاگرد کو

استاد کی کرنی چاہئے۔ پیری مریدی اور استادی شاگردی کا مقام سمجھنا ہو تو حضرت مدنی دامت برکاتہم کے اس عمل سے سمجھنا چاہیئے کہ اپنے شیخ اور استاد کے لئے آپ نے پھانسی کے تختہ کو اپنی زندگی پر ترجیح دی یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ یہ لوگ انگریزی گورنمنٹ سے بچ گئے ہیں موت کے تختہ کو خدمت کے لئے قبول کر لینا مولانا مدنی کا ہی مقام ہے ہندوستان کی جنگ آزادی میں جس طرح سچائی اور دیانت داری سے آپ نے کام کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے ۱۹۴۷ء کے الکشن میں مولانا آزاد نے گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ مولانا حسین احمد مدنی کا دل جس طرح اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے اسی طرح ان کا جسم بھی اللہ کے سامنے جھک گیا ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے زیادہ کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی۔

حضرت مدنی حج کو بھی تشریف لیجا رہے ہیں اور ۱۹ سال کے بعد اپنے رشتہ داروں سے بھی ملیں گے ۱۹۴۷ء کے بعد سفر کا ارادہ سات سال تک آپ نے نہیں فرمایا کیوں اس لئے کہ حضرت یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان میں نئے مسائل جو پیدا ہو گئے ہیں ان کا مقابلہ کرنا ہے تاکہ آزادی قائم رہ سکے اور مسلمانوں کو یقین دلانا کہ وہ اطمینان سے بیٹھے رہیں انشاء اللہ تعالیٰ حالات درست ہوں گے اس کام کے لئے حضرت مولانا نے جو مسافت طے کی وہ لاکھوں میل سے کم نہیں چونکہ پروپیگنڈہ ہی کے عادی نہیں بلکہ اس کو غلط سمجھتے ہیں۔ اس لئے دنیا نہیں جانتی کہ آپ نے اس زمانہ میں ملک کی کیا خدمت کی ہے۔

حضرت مدنی کسی ایک کے نہیں بلکہ سب کے ہیں بعض لوگوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ مولانا مدنی کسی خاص جماعت یا کسی خاص گروہ سے وابستہ ہیں ایسا سمجھنا لوگوں کی غلطی ہے حضرت مولانا کو پوری انسانیت سے محبت ہے اور اس کی خدمت کرنیکا جذبہ ہے کوئی بھی آدمی آپ کے پاس جائے وہ آپ کا گیا ہے

مخالف ہو کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو۔ اس کی تکلیف کو دور کرنے کے لئے آپ پوری کوشش فرماتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ مولانا کا یہ سفر حج ہندوستان کیلئے بہت برکتوں کا ثابت ہوگا۔ ہم سب کو اللہ سے دعا کرنی چاہیئے کہ حضرت خیریت سے تشریف لے جائیں اور اپنے نیک ارادوں میں کامیاب ہوں اور خیر و عافیت سے واپس تشریف لائیں۔ تاکہ آپ کے اور علمی فیض سے لوگ نفع اٹھائیں۔

(حبیب الرحمٰن) ————

مولانا عبیداللہ سندھی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مکہ میں سلطان ابن سعود نے موتمر اسلامی کا ایک اجلاس بلایا تھا جس میں ہندوستان کی طرف سے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی زیر قیادت کافی بڑی تعداد پر مشتمل ہندوستان رہنماؤں کا ایک وفد بھی شامل تھا۔ ۱۳۴۴ھ کا یہ زمانہ حجاز و نجد میں سعودی راج کا دوسرا سال تھا حجاز کے بدوؤں پر سعودی رعب طاری تھا شریف کے زمانہ کے بڑے بڑے شیوخ سانس نہ لیتے تھے۔ اسوقت مکہ میں دنیا کے دو بڑے انقلابی وارد ہوئے ان میں سے ایک شیخ سنوسی جو مجاہد ریف عبدالکریم غازی کی تحریک کے روح رواں تھے اور فرانس کے ظلم وستم سے بچ کر کسی طرح نکل آئے تھے دوسرے مولانا عبیداللہ سندھی۔

حضرت شیخ سنوسی تو حج بیت اللہ سے پہلے ہی مکہ معظمہ میں آچکے تھے اور ان کی بڑی شہرت تھی جس جگہ شیخ کا قیام تھا میں نے دیکھا سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگ صبح سے شام تک وہاں آجا رہے ہیں شیخ فرانس کے باغی تھے فرانس برطانیہ کا اتحادی تھا اس لئے وہ برطانیہ کے بھی باغی تھے۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ انہوں نے ایک با ہمت نوجوان عبدالکریم کے ساتھ مل کر سپین کو دوبارہ فتح کرنے اور مراکش کو آزاد کرانے کی کیوں کوشش کی۔

شیخ سنوسی نماز عصر کے بعد مغرب تک اپنے حجرے کے باہر بیٹھے ان کے گرد سیکڑوں تشنگان علوم دینیہ اور علماء وفضلا کا مجمع رہتا میں بھی اس مجمع میں بیٹھتے لیکن حکومت کے خوف کی وجہ سے کسی کو جرات نہ ہوتی کہ کوئی سیاسی سوال شیخ سے کرے البتہ عبادات و معاملات و بعض دقیق نکات اور قرآنی نکتوں کے بارے میں لوگ سوالات پوچھتے تھے جن کا پوری بصیرت کے ساتھ مدلل جواب شیخ سنوسی ارشاد فرماتے اور لوگ شیخ کی تقریر سننے

کیلئے ہمہ تن گوش ہوجاتے

میں بھی شیخ کی اس مجلس میں روزانہ جاتا اور اکثر شیخ کے دائیں پہلو کے قریب ہو کر بیٹھ جاتا شیخ بھی مجھ کو بہت محبت کرتے تھے کیونکہ وہ شاید سن چکے تھے کہ یہ بھی ایک باغی کا بیٹا ہے مجھے بھی اس چیز نے شیخ کا عقیدہ مند بنا دیا تھا کہ وہ بھی ہمارے ہی خاندان کی طرح انگریزوں کے باغی تھے۔

مکہ میں آمد

کوئی دو چار مہینے گذرنے کے بعد ایک شام کو ایک اور شخص سے میرے استاد نے تعارف کروایا۔ انہیں جان تے ہو کون ہیں میں نے عرض کیا نہیں حضرت شیخ الہند دیوبند والوں کے شاگرد مولانا عبیداللہ ہیں یہ بھی انگریز کے دشمن ہیں اور بڑی مدت سے ہندوستان سے بھاگے ہوئے ہیں مولانا عبیداللہ صاحب ہم لوگوں سے کچھ فاصلہ پر بیت اللہ شریف کی کنکریوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

ننگے سر گلے میں کھدر کا رومال کھدر کا کرتا اور پاجامہ عربی قبا یہ ان کا لباس تھا مولانا عبیداللہ قد درمیانہ رنگ گندمی پیشانی کشادہ بیزوی چہرہ بڑی بڑی چمکدار آنکھیں چال مجاہدانہ گفتگو عالمانہ اور حکیمانہ حافظے کے قوی دل دنیا کے ہزاروں مصائب بھی ان کے دل کو مضمحل نہ کر سکے وہ ہندوستان سے حضرت شیخ الہند کے حکم پر کابل گئے تھے اور کابل میں ایک حد تک اپنے مشن میں کامیاب رہے امان اللہ سے انہیں نے ہندوستان پر حملہ کرا دیا لیکن شکست کے بعد مولانا نے اپنا رابطہ امان اللہ سے ختم کر کے ماسکو سے جوڑ لیا اور بقول مولانا ہم سات برس تک سرحد آزاد میں ایک غار میں رہ کر ہندوستان

کو رہ نمائی دی اور سرحد آزار میں انگریزوں کے خلاف بغاوت بند نہ ہونے دی۔

امان اللہ خاں کے انگلستان لندن کو روانہ ہونے سے چند روز پیشتر ہی سرحد آزاد اور کابل کی حدود سے نکل کر روس چلے گئے۔ اور تین سال تک روس کے دفتر خارجہ میں مقیم رہے روسی انقلاب۔ پسند لینن سے مولانا نے علمی تبادلہ خیالات کیا اور ایک حد تک روس کے سائنس اور مارکسزم کے ماننے والوں کو قائل کیا اور بقول مولانا کے ہم روس میں عام کی حقانیت کو سمجھتے بھی تھے اور سمجھاتے بھی تھے دونوں باتیں ایک ساتھ چلتی رہتی تھیں۔

دفتر خارجہ روس میں

دفتر خارجہ روس میں مولانا کا کام برطانوی حکومت کے ایسے سوالات کا جواب دینا تھا جو برطانوی حکومت کی طرف سے سرحد آزاد کی بغاوت کے متعلق بار بار روس کو بھیجے جاتے تھے۔ مولانا نے ایک موقعہ پر فرمایا۔

جب برطانوی وزیر خارجہ نے روس کو لکھا کہ روس عبید اللہ کی امداد کیلئے چالیس ہزار روپیہ سالانہ خرچ کیا گیا ہے تو ہم اس کے جواب میں روس کے وزیر خارجہ سے لکھوایا کہ برطانیہ نے امان اللہ کے ذریعہ انور پاشا کو روس کے خلاف جنگ کرنے پر اکسایا اور اسے روپے اور آدمیوں سے مدد بھیجی اس لئے کیوں نہ برطانیہ کے ساتھ ہم اپنے صلح کے عہد کو منسوخ کر دیں۔

بس اس جواب کو پڑھ کر برطانیہ کے وزیر خارجہ ٹھنڈے پڑ گئے

روس میں مولانا کے ساتھ ہندوستان کے انگریزی داں طلبا بھی تھے جو مولانا اپنے ان ساتھیوں کی بیحد تعریف فرماتے تھے کہ یہ لوگ سچے انقلابی

تھے اور مشکل سے مشکل جد وجہد کرنے سے بھی نہ گھبراتے تھے۔

اس دوران میں مولانا کی ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی پنڈت نہرو نے میری کہانی میں مولانا کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے دور میں انقلابی عالم میں نے کم دیکھے ہیں۔ پنڈت نہرو مولانا کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہیں۔

نظریہ فیڈرل حکومت

مولانا سیدھے روس سے ترکی آگئے۔ ترکی آکر مولانا نے ہندوستان اور ترکی کو فیڈرل حکومت بنانے کا مشورہ دیا۔ اور ایک مجمل خاکہ فیڈرل، حکومت کا شائع کیا۔ جو آپ نے روس دوران قیام میں سوچا اور سمجھا تھا۔ اسوقت ترکی میں پارلیمنٹ کا اجلاس ہورہا تھا اور ہندوستان میں دستوری اور آئینی بحثیں چل رہی تھیں۔ مولانا فرماتے ہیں ہم نے فیڈرل نظام حکومت روس میں سوچا تھا جب ہم ترکی آئے تو اس فیڈرل نظام حکومت کا خاکہ شائع کردیا۔ ترکوں نے ہماری بات نہ سنی اور انہوں نے ہم سے بحث کی اور ہم انہیں اکثر باتیں سمجھانے میں کامیاب ہوگئے۔

ادھر ہندوستان والوں نے اس وقت ہمارے پیغام کو نہ سنا اور ہماری بات کو نہ مانا۔ لیکن برطانوی حکومت ہمارے بیان کو سمجھ گئی اور اس نے ہندوستان میں غلط قسم کی فیڈرل حکومت بنانیکا اعلان کردیا۔

مولانا عبیداللہ صاحب چار برس تک ترکی میں مقیم رہے آخر ۱۹۲۶ء کے آخر میں آپ ترکی سے مکہ معظمہ تشریف لے آئے۔ یہاں پہونچکر آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا درس دینا شروع کردیا لیکن

مولانا یہ کتاب بھی اپنے مخصوص شاگردوں کو پڑھاتے تھے۔

اس لئے کہ مکہ میں آپ کو شیخ سنوسی سے بھی زیادہ خطرناک باغی تصور کیا جاتا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نہایت ہی خوددار غیور تھے مکہ مکرمہ میں آپ کی آمدنی کے تمام سلسلے منقطع ہو گئے تھے۔ اور کسی طرف سے ایک پیسہ کی امداد نہ ملتی تھی لیکن ارض مقدس کے وہ ٹکڑے اب بھی شاید ہیں جن پر مولانا عبید اللہ کی زندگی کے دس برس گزرے کہ اس مرد مجاہد نے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ مکہ میں ابن سعود کی نوازشیں اطراف و اکناف عالم سے آنے والے علماء پر ہوتیں لیکن عبید اللہ اور شیخ سنوسی دو ایسی ہستیاں تھیں مکہ میں جنہوں نے ابن سعود کی ہر پیش کش کو رد کر دیا اور عسرت میں رہ کر خود داری کی زندگی بسر کرتے رہے۔

قیام مکہ میں آپ کی خدمت میں پروفیسر محمد سرور صاحب نے حاضر ہو کر ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ کا خط دیا مولانا نے سرور صاحب کو چند ہی لمحوں میں جانچ لیا کہ یہ نوجوان میرے کام کا ہے اور ڈاکٹر صاحب کا انتخاب غلط نہیں پروفیسر محمد صاحب نے مولانا کی خدمت میں کافی عرصہ گزارا جب آپ ہندوستان تشریف لائے تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی درخواست پر جامعہ اپنایا۔ اور جامعہ میں

کی بنیاد رکھی۔

مکہ کے بعد میری پہلی ملاقات مولانا سے کراچی میں ہوئی مکہ میں جو مولانا عبید اللہ میں نے دیکھے تھے وہ اب نہ تھے بلکہ مزاج میں برہمی پیدا ہو گئی تھی اور یہ برہمی واقعات پر مبنی تھی اس دفعہ دوران گفتگو میں فرمانے لگے۔

فکر اور پیش گوئی

ہم لوگوں کی باتیں اس لئے نہیں سننا چاہتے کہ ان لوگوں نے گزشتہ

دو برس باتیں بنائی ہیں یہ لوگ عمل سے عاری ہو چکے ہیں ہمارے پاس ایک پروگرام ہے اور فکر ہے ہم اپنا فکر دوسروں سے منوانا چاہتے ہیں اور ہمارے پروگرام پر لوگوں کو چلنا پڑیگا۔ اگر کوئی ہمارا پروگرام قبول نہیں کریگا تو اس کے لئے ہلاکت ہے ایک دفعہ مکان پر چائے پی رہے تھے کہ لوگو کے مصائب کا ذکر آگیا فرمانے لگے ہندوستان میں کس نے مصیبت دیکھی ہے۔

یہاں جیل خانہ بڑی قربانی ہے ہمارے ساتھیوں نے جو مصیبت اٹھائی ہے اسکا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ہماری ایک رات بھی جلا وطنی میں چین سے گذری لیکن ہمارے ساتھیوں کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی مصیبت نہیں تھی کابل میں جمال پاشا کی بیوی کا خط جرمنی سے آیا تھا کہ اگر ایک ماہ کے اندر ایک ہزار پونڈ جرمنی نہیں آئے گا تو میں اور لڑکیاں خودکشی یا پیشہ کرانے پر مجبور ہونگی۔ یہ ہے مصیبت ہندوستان میں مصائب کا ذکر کرنیوالے بزدل ہیں۔ مولانا غلط خوشامد جھوٹی عقیدت سے نہ صرف گریز کرتے تھے بلکہ ہر گفتگو میں ان چیزوں کی مخالفت کرتے۔ جھوٹی عقیدت، خوشامد اور کو اتنا برا کہتے تھے کہ بعض دفعہ ملنے والوں کے لئے یہ موضوع گفتگو ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے ہندوستان پہونچ کر بہت بڑا کام یہ کیا کہ اپنے فکر کو بہت جلد علمی طبقہ سے روشناس کرایا۔ اپنے فکری رجحانات اور پروگرام کے بارے میں خود بھی بہت لکھا اور مولانا کے فکری سکول کے ماننے والوں نے بھی ان سے سن کر بہت کچھ قلم بند کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کو سیاسی تحریک ایسے انداز میں سامنے لے آئے جو آج تک نہ آئی تھی مولانا شدت کے ساتھ آنے والے انقلاب کی پیشگوئیاں کر کے گئے ہیں۔ اور ان کی پیش گوئیاں د اور دلائل پر

پر مبنی ہیں۔ آنیوالے ہر حالات کا مولانا صحیح اندازہ لگا گئے ہیں۔

عزیز الرحمٰن

مولانا عبیداللہ سندھی

مولانا عبید اللہ سندھی جاں فروش علم بردار حدیث، جید عالم اور مفکر تھے۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم نے انہیں فراموش کردیا جن کی زندگی عمل پیہم اور مجاہدہ تھی آج بھی اسباب کی شدید ضرورت ہے کہ ابنائے وطن عموماً اور مسلمانان ہند خصوصاً آپ کی مجاہدانہ زندگی اور انقلابی تحریک کا مطالعہ کریں اور اس سے مستفید ہوں آپ کی زندگی آپ کی تحریک اور ارشادات مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اور آج کے بدلے ہوئے حالات میں بھی پوری طرح نشان راہ کا کام انجام دیتے ہیں۔

جب قوموں کا پورا چکر کاٹ کر نئے سرے سے زندگی کیلئے تگ ودو شروع کرتی ہے تو عہد زوال کے انہیں بزرگوں جنہوں نے قوم کے زوال کی روک تھام کیلئے جان توڑ کوشش کی تھیں کے انکار سے قوم کے دماغوں میں نئی حرکت اور ان کے دلوں میں نئے ولولے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح نئی نسلیں ان سے نئی امید سے نئی زندگی حاصل کرتی ہیں درپیش لفظ مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد۔

لہٰذا۔ ان کے ذاتی حالات اور ان کی تحریک کا خلاصہ استفادہ کیلئے درج ذیل ہے۔

خاندان اور پیدائش

آپ ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں اپیانوالی میں ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء میں ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے آپ کے نانا سکھ تھے اور انہیں کے اصرار پر آپ نے سکھ نیتھ مذہب اختیار کیا۔ آپ کے والد کا نام رام سنگھ تھا جو آپ کی پیدائش سے چار ماہ پہلے انتقال کر چکے تھے دادا کے مرنے کے بعد آپ کی والدہ میکے لے آئیں۔ اور وہاں چھ سال کی عمر سے جام پور کے اردو مڈل سکول میں

آپ کی تعلیم شروع ہو گئی ۔

مطالعہ اسلام اور قبول اسلام

کوئی بارہ برس کی عمر ہو گی کہ ایک آریہ سماجی لڑکے کی معرفت آپ کو پنڈت اننت رام جو بعد میں مسلمان ہو گئے اور اپنا نام عبداللہ رکھ کی کتاب تحفۃ الہند ملی جس کے مطالعہ کے بعد آپ کے دل و دماغ میں نئے ولولے اور نئے خیالات پیدا ہونے لگے ۔ پھر دوسرے دوستوں کی معرفت مولانا اسمٰعیل شہید کی کتاب تقویت الایمان پڑھنے کا موقعہ ملا اور ایک پنجابی کتاب احوال الآخرت کے مطالعہ کے ساتھ آپ نے نماز سیکھ لی اور تحفۃ الہند کے معنف کے نام پر اپنا نام عبداللہ رکھا ۔ بہرحال سنت تطہیر کے بعد اظہار اسلام کی غرض سے اور اعزا کے تعاقب سے بچنے کیلئے آپ سندھ چلے گئے اور حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈی والے کی خدمت میں پہونچ گئے ۔ جنھوں نے حق پدری ادا کیا ۔ اور اسی وجہ سے مولانا سندھ کو اپنا وطن مانتے تھے وہ اسی وقت کے جنید اور سید العارفین تھے مولانا کا کہنا ہے کہ ان کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی ۔

آپ نے پھر ریاست بہاولپور کی ایک دیہاتی مسجد میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے وہاں ان کی ذہنیت دیکھ کر مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اول نے کہا کہ تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہو گا ۔ آپ نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا بہرحال معروف علماء وقت کے آگے آپ نے زانوئے ادب طے کئے اور اسلام پر کماحقہ بصیرت حاصل کی آپ نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ ۱۳۰۵ھ میں حضرت

شیخ الہند نے اجازت نامہ تحریر فرماکر بھیجدیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد پڑھی ۱۳۰۸ء میں آپ دوسرے خلیفہ مولانا ابوالحسن تاج محمد صاحب کے پاس امروٹ ضلع سکھر چلے گئے انہوں نے آپ کا نکاح سکھ کے اسلامیہ سکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خاں یوسف نوی کی لڑکی سے کرایا۔ اور مولانا کی والدہ کو بلایا جو تاحیات آپکے پر رہیں پھر آپ نے حدیث اور دوسرا فقہ حنفی پر جس کو علماء دیوبند نے بہ نظر تحسین دیکھا۔ امروٹ واپس آکر دارامر شادگوٹھ پیر جھنڈا قائم کیا۔ بعض عربی اور سندھی کتابیں جو نایاب تھیں طبع کرائیں اور ایک ماہوار رسالہ ہدایت الخوان شائع کیا۔ یہاں آپ نے پھر آنحضرت صلعم کی زیارت کی اور خواب میں امام مالک کو دیکھا۔

سیاسی تحریک کی ابتدا

شیخ الہند کے ارشاد پر آپ دہلی منتقل ہو گئے۔ وہاں آپ کا تعارف ڈاکٹر انصاری مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی سے ہوا ویسے بھی ایک پنجابی گھرانے سے تعلق رکھنے کے سبب آپ وہاں کے تکلیف دہ حالات سے متاثر تھے مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریروں نے آپ کو وجدانی کیفیت کو ابھارا قومی رہنماؤں کی ملاقاتوں نے آپ کو قومی تحریک سے قریب سے قریب تر کیا، ابتک آپ عوام اسلامیہ کی تحصیل میں مصروف تھے اور اب ان عوام کی روشنی میں آپ قومی تحریک کی راہ پر آرہے تھے اور وہاں کی ایک سیاسی جماعت سے منسلک ہو گئے۔

اس حالت میں شیخ الہند کے حکم پر ۱۹۱۵ء میں پوشیدہ طور پر آپ کابل گئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کابل کی ہجرت کا حکم اتحاد اسلام کی موجوجہد کے سلسلے میں دیا گیا تھا جس کا ایک نتیجہ تحریک خلافت کو کہہ سکتے ہیں مولانا نے اپنی سوانح میں

لکھا ہے کہ امیر حبیب اللہ اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستان کام کو زیادہ پسند کرتے تھے انہیں کے حکم پر مولانا نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنا شروع کیا۔ اور امیر امان اللہ کے دور میں ۱۹۲۲ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ کابل میں قائم ہو گئی۔ جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوشش سے کانگریس کے گیا سیشن میں منظور ہوا برٹش امپائر (BRITISHEMPIRE) سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی تھی۔ جس کے آپ صدر ہوئے اور اس طرح ملک سے باہر رہ کر ملک کی خدمت اور اسے نجات کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ تب سے آپ کی ایک مستقل ہو گئی۔ اور اور کانگریس کمیٹی کے ایک عہدیدار ہونیکی حیثیت سے آپ ہر جگہ عزت پاتے رہے مولانا فرماتے ہیں کہ کانگریس کو بین الاقوامی تعارف حاصل ہے۔ افغانستان روس ترکی ہر جگہ مولانا کو کانگریس ہونے کے سبب سہولتیں بہم پہونچائیں۔

ترکی جاتے ہوئے آپ نے سات ماہ کیلئے میں قیام کیا۔ یہ روس کی انقلابی دور کا ۱۹۲۲ء تھا۔ وہاں آپ نے ایک فرسودہ نظام شہنشاہی کو گرتے دیکھا۔ جو غریبوں کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اور ان کی محنت پر عیش و نشاط کی محفلیں گرم کرتا تھا جہاں غریبوں اور پامال مزدوروں اور کسانوں کے علم بغاوت کو زار شاہی کے در و دیوار پر نصب پایا۔

زمانے کے انداز بدل گئے

کانگریسی ہونے کی وجہ سے سویت روس نے آپ کو اپنا معزز مہمان بنایا۔ اور مطالعہ کی ہر سہولیت فراہم کی۔ عام طور پر لوگوں میں چرچا ہے کہ آپ لینن کے مہمان تھے۔ اور آپ کو اس کی محبت نصیب تھی۔ مولانا نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ غلط ہے میں لینن سے ملا۔ کاہر بڈ لینن اسوقت ایسا بیمار تھا

کہ قریبی دوستوں کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں انقرہ پہونچے۔ سفیر ترکیہ متعین ماسکو اور وزارت خارجہ ماسکو نے آپ کے سفر اور راہ کا تعین کیا تاکہ برطانوی عملوں اور کارندوں کو خبر نہ ہو سکے۔

بہرحال آپ جب ترکی پہونچے تو مصطفےٰ کمال اتاترک کی رہنمائی میں ترکی نشاۃ ثانیہ ہو رہی تھی۔ فرسودہ نظام کی جگہ ایک خالص قومی اور ترقی پذیر نظام کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔

وہاں مولانا عبیداللہ نے اتحاد اسلام کی کوئی گنجائش نہ پائی۔ ترکی کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے جو تحریک خلافت شروع کر رکھی تھی، اس کے تھرکی بالکل نہیں تھے۔ وہاں کی معاشرتی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے بتایا ہے کہ کمال پاشا نے دیہاتیوں کو   کے برابر کر دیا۔

آپ کے ایک معمولی خط پر لالہ لاجپت رائے آپ سے ملاقات کرنے اور تبادلہ خیالات کرنے کیلئے ترکی گئے۔

سنہ ء میں حج کے موقعہ پر مکہ معظمہ میں سو تمبر منعقد ہوئی اس کی شرکت کو ہندوستانی دوستوں سے ملاقات کرنے آپ وہاں گئے آپ سو تمبر کے بعد پہونچ سکے۔ آپ مکہ معظمہ میں ۱۴ سال تک علمی مشاغل میں مشغول رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی کوششوں سے حکومت برطانیہ نے واپس آنے کی اجازت دیدی۔ اور آپ کو ۲۴ چوبیس سال بعد سنہ ۱۹۳۹ء میں وطن عزیز واپس ہوئے۔

آتے ہی آپ نے بتایا کہ اس عمر میں خانہ کعبہ میں باقی دن گذارنا بہتر تھا۔ لیکن اپنے علم احساسات اور تجربات سے ملک کے نوجوانوں کو آشنا کرنے نیز ملک عزیز کی خدمت کا جذبہ ہی ہندوستان کھینچ لایا۔ آپ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن ملک عزیز کے روشن چہرے پر غلامی کا دھبہ اور مسلمانوں

کی کج روی مولانا کو حد درجہ پریشان کئے ہوئے تھی۔ قومی محاذ سے مسلمانوں کا الگ ہو جانا اور ان سے پیدا ہونے والے حالات کے اندیشہ نے مولانا کو ایک پل چین نہ لینے دیا ان کی غیر حاضری میں مسلمانوں نے ایک عجب طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ قدرتی طور پر اس کے کچھ لازمی نتائج برآمد ہونے والے تھے۔ جو بہت ہی اندوہناک نظر آرہے تھے۔ مولانا کی دوربینی ان حالات کو پڑھ رہی تھی جس سے ہم دوچار ہوئے اور جس کا خمیازہ ہم بھگتتے رہیں گے جب تک ان کی پیش کردہ راہ پر گامزن نہ ہوں۔

مولانا گاؤں گاؤں پھرے دستک دیدے کر مسلمانوں کو مخاطب کیا افتراق پسندی سے پیش آنیوالے نتائج سے متنبہ کیا قومی راستہ سے علیحدگی پر ڈانٹا مسلم لیگ کے دعوؤں کو باطل قرار دیا۔ اور مسٹر جناح کی قیادت کو گمراہ کن بتایا اور قرآن کی روشنی میں متعین کردہ راہ کی ترویج و اشاعت میں لگ گئے۔

کئی بار ایسا ہوا دوران تقریر آپ پر غشی طاری ہو گئی ہوش و حواس درست کر کے آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھا حالت بد سے بدتر ہو گئی لیکن جد و جہد سے باز نہ آئے۔ آخر جب حالت غیر ہو گئی تو آپ اپنی صاحبزادی اور نواسے کی درخواست پر دینپور ریاست بہاولپور تشریف لے گئے اور وہیں ۱۰ راگست ۱۹۴۴ء کو وفات پائی۔

مولانا نے قومی مسائل کے کسی پہلو کو اپنی پرواز فکر سے پرے نہیں رکھا ان مسائل کو تاریخی واقعات اور حالات کی روشنی میں جانچا اور عوام کو ان کے حل سے آگاہ کیا۔

مسلمانوں کے تمام مذہبی وسیاسی مسائل خاص طور پر ان کے زیر غور رہے اور آپ نے غور و فکر کے نتیجہ سے مسلم خواص و عام کو آگاہ کیا۔ مولانا نے کوئی بات

ان کبھی نہیں چھوڑی۔ لیکن مسلمانوں کے ذہن میں کچھ ایسا زہر بھر دیا گیا تھا کہ بنی ان سنی کر دیتے تھے۔

آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کی قائم کردہ سندھ ساگر اکیڈمی ٹمپل روڈ لاہور آپ کی تصنیفات اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیفات کے اردو ترجمے شائع کرتی رہی نہ جانے پاکستان بننے پر ان پر کیا گذری اور ان کا سلسلہ اشاعت جاری ہے یا نہیں۔

۷۸۶

"گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را"

اتحاد و ترقی کے داعی

مولانا ابوالکلام آزاد

سے

کانفرنس مسلمانان ہند جنوری ۱۹۲۵ء میں یہ منظوم سپاسنامہ مولانا ابوالکلام کی خدمت میں مولانا قمر الہدیٰ فریدی صاحب نے پیش کیا تھا یہ ایک نادر دستاویز ہے جو نکتے آپ نے بیان کئے ہیں وہ آج ایک انقلاب معلوم ہوتا ہے۔

منظوم سپاسنامہ

اے امامِ ہند اے علم و ادب کے تاجدار
اے امامِ کاروانِ حریت، گردوں وقار
اے خطیبِ بے بدل اے عالمِ اُمّ الکتاب
اے زسرتاپا سیاست اے امامِ انقلاب
اے تدبر کے خزانے اے تفکر کے اساس
اے حکیمِ قوم نباضِ وطن نکتہ شناس
اے عزائم کے فلک، سعی و عمل کے آفتاب
اے نویدِ صبحِ آزادی، نقیبِ انقلاب
اے بہشتِ علم فردوسِ عمل خلدِ یقین
اے نسیمِ شاخِ سدرہ نکہتِ عرشِ بریں
اے شہنشاہِ خطابت معدنِ علم الکلام!
اے دلِ مایوس کی درسِ امیدوں کو پیام
اے نگارش کے مجدد اے ادیبِ باکمال
اے کلام اللہ کے شارح "مدیرِ الہلال"
اے نشانِ راہِ منزل اے دلیلِ خضرِ راہ
اے حدیثِ اوجِ ملت اے فروغِ لا الٰہ
اے مبصر، اے شبِ دیجور کے روشن چراغ
اے جنیدِ عصرِ حاضر اے مدیرِ البلاغ!
اے محبت کے ستوں اے مظہرِ خلقِ عظیم

اے فروغِ عقلِ دانش منبعِ عقلِ سلیم
اے محی الدین اے آزاد اے فیروز بخت
اے ضیائے رسمِ احمدؒ وارثِ تسبیح و تخت
اے امام احمد کے سچے جانشیں اے سرفروش
اے دلِ اہلِ عزیمت کی خلش اے سخت کوش
اے مجددِ الفِ ثانی شیخ احمدؒ کی امید
سید احمدؒ کی تمنا حسرتِ قلبِ شہیدؒ
اے جمال الدین افغانی کے مستقبل کی آس
اے ولی اللہؒ کی تحریکِ حکمت کی اساس
اے امینِ رازِ فطرت اے چراغِ انجمن
اسوۂ قاسمؒ کے پرتو، عکسِ محمود الحسن!
اے حقائق کی تجلی اے دلِ شبلی کے راز
اے حدیثِ رنگ و بو، سجادؒ کے سوز و گداز
اے مشیت کے نشاں اے سیہ گیتی کے نور
اے کتابِ کربلا کے ترجمے "بین السطور"
اے علمبردارِ حق اے رہبرِ باطل شکن!
اے ہمارے خضرِ منزل اے امامِ علم و فن
اے جہانِ علم و فن کے یکتا پیدا کنار
نثر کی دنیا میں طرزِ خاص کے پروردگار
اے مجسم آگہی اے آب و رنگِ ہست و بود
اے نوائے زندگی اے نغمۂ ترکِ جمود

اے کلید نقشِ بابِ حریت، عالی نسب
اے غرورِ ہند، فخرِ ایشیا، رشکِ عرب
اے فراست کے ہمالہ، اے بصیرت کے فلک
اے مسلمان اور ہندو کی متاعِ مشترک
اے انیسِ ملک، اے پیغامِ امن و عافیت
اے شعارِ نیرِ انصاف، کنزِ معدلت
اے جہادِ زندگانی کی کتابِ زر فشاں
نام تیرا رہبرِ آزادیٔ ہندوستاں
تیری صورت نقش و نگارِ کائنات
تیری سیرت عرش کی قندیل، نورشش جہات
تیری جرأت مژدۂ رنگینیٔ صبحِ بہار!
تیری ہمت ہرچہ بادا باد کی آئینہ دار
لب کشائی میں تری پنہاں پیامِ رنگ و بو
نقش پیشانی پہ تیری آیۂ لاتقنطو!
دیدۂ بینا ترا سرچشمۂ حق الیقین!
تیری نظر دل پر نمایاں دامِ ہر رنگِ زمین
تیری ہستی نہرِ جنت، چشمۂ آبِ حیات
صد گلستاں بر کف و صد گل بداماں تیری ذات
ذات میں فقر و امارت، دونوں باحدِ کمال!
تیری ہستی محبت المبرین کی زندہ مثال
تیرا سینہ جلوہ گاہِ نیرِ عرشِ عظیم!

تیرا دل مسحورِ تنزیلٌ من الرب رحیم
کامیابی تیرا حصہ کامرانی تیرا حق

تو نے دنیا کو دیا خود اعتمادی کا سبق
عمر بھر کی تو نے جور و ظلم کی طاقت سے جنگ

جیل تیرا گھر تو گھر کی زندگی قید فرنگ
امتزاج سنگ و آہن سے بنا تیرا مزاج

لے لیا گاندھی سے تیری استقامت نے خراج
دم بخود کوہ ہمالہ تیرے استقلال پر

تیری عظمت نے اثر ڈالا جواہر لال پر
رائے کی تیری ہمیشہ کانگریس نے قدر کی

حیثیت ہر حال میں تیری رہی ہے عہدہ کی
سامنے شملہ میں آیا جب ترے "ویول پلان"

تو ہوا ردِ عمل میں اس کی ثابت اک چٹان
بات میں تیری سیاست کی ہوا کرتی ہے بات

کھا گیا کیبنٹ مشن دہلی میں آخر تجھ سے مات
بعد میں ہے گا مورخ ہاتھ میں اپنے قلم!

پھلے وہ کھائے گا تیری استقامت کی قسم
لیکن اے علم و معارف کے ترے یہ کامیاب

کچھ بہ اندازِ دگر اب تجھ سے کرنا ہے خطاب
یعنی اذنِ التجا دارم یہ تو ہا صد ادب

تا بہ قوم صدائے غم دہد ساز طرب

تجھ سے پوشیدہ نہیں قوم و وطن کی کیفیت
ان دنوں پوری جوانی پر ہے فرقہ واریت
ہے ادھر کثرت بدہضمی ادھر قلت کا غم
دونوں پاگل بن گئے انگریز کے سر کی قسم
آج دست عقل ہے جنوں کی باگ پر
قصر مستقبل بنایا جا رہا ہے آگ پر
جا رہی ہے فطرت اقوام پستی کی طرف
بڑھ رہا ہے ملک پھر فرقہ پرستی کی طرف
کارفرماں ملک میں ہیں قوتیں تخریب کی
توڑ دی کوتاہ بینی نے کمر تہذیب کی
ہند و پاکستان دوزخ کے نمونے ہو گئے
گھر تو گھر سیکڑوں دیہات سونے ہو گئے
رفتہ رفتہ غم کے بادل روح پر چھانے لگے
کشت گلزار وطن کے پھول مرجھانے لگے
گر رہی ہے پے بہ پے برق تعصب فہم پر
قوم نے قربان کر ڈالا یقین کو وہم پر
دھار پر خنجر کی قائم ہے اخوت کا نظام
چھوڑ بیٹھا آدمی انسانیت کا احترام
پریم کے سانچے میں اب طرز عمل ڈھلتا نہیں
آدمی انسانیت کی راہ پر چلتا نہیں
بھائی چارہ کا نہیں اب رہبروں کے دل میں جوش

ہندو مسلم بھائی بھائی کہنے والے ہیں خموش

تلخ گوئی سے پڑی جاتی ہے کانوں میں خراش

دل ہوا جاتا ہے طعنوں کے اثر سے پاش پاش

دوست کا چہرہ خلوص قلب کا مظہر نہیں

ہے وہی آئینہ لیکن اسمیں وہ جوہر نہیں

انتہائی کشمکش میں آج ہندوستان ہے

اور مخلوق خدا بے چین ہے حیران ہے

مطلع امید پر غم کی گھٹائیں چھا چلیں

زندگی تھی جن سے وہ چنگاریاں کجلا چلیں

سحر انگلستان سے ہیں مسحور اب قلب و دماغ

ہنس کی چالوں پہ چلنا چاہتے ہیں اب بھی زاغ

آنکھ لندن پر کسی کی اور کسی کی روس پر

دی گئی ترجیح یوں موہوم کو محسوس پر

جا رہی ہے ناؤ آزادی کی آندھی کی طرف

رخ ہے جیرہل کی طرف اور پشت گاندھی کیطرف

ڈر رہا ہوں نظم آزادی میں خامی آ نہ جائے

خوف ہے پھر لوٹ کر دورِ غلامی آ نہ جائے

دد وطن بر پاست از کردار طوفانِ دگر..!

نیم از چشم تحیر ساز و سامانِ دگر...!

اسقدر بھی ہو کہ پیہم اک دل ناشاد میں

بہہ رہے ہیں اشک خوں گزرے ہوؤں کی یاد میں

ڈر ہے آزادی کا اِدا آندھیوں سے گر نہ جائے
کی ہیں جو قربانیاں ان سب پہ پانی پھر نہ جائے
ملک دشمن طاقتیں ہیں ملک میں مصروف کار
سب سے بازی لے گیا اس دور میں سرمایہ دار
آج دریائے شک شبہات میں ایک جوش ہے
اور ساز اعتماد باہمی خاموش ہے!
ہے عوام الناس کا میلان شاہی کی طرف
بڑھ رہا ہے قافلہ تباہی کی طرف
حور آزادی کھڑی ہے قیصری کی چھاؤں میں
یعنی کامن ویلتھ کی بیڑی پڑی ہے پاؤں میں
ضابطہ جینے کا قائم ہے نہ مرنے کا نظام
رو رہی ہے زندگی اور ہنس رہا ہے انتقام
زلزلہ برپا ہے ہر ایوانِ پر تمکین میں آج
زہر گھولا جا رہا ہے ساغرِ آئین میں آج
آج تیری قوم ہے وہم و تذبذب میں اسیر
ایسی حالت میں بتا کہتا ہے کیا تیرا ضمیر
جوہر ذاتی سے پھر اک بار اپنے کام لے
اٹھ خدا کے واسطے گرتے ہوؤں کو تھام لے
ساتھ شیخ الہند مولانا حسین احمد کو لے
اور خوف و دہشت کی طنابیں کھینچ دے
ہاتھ اٹھائیں مفتیٔ اعظم دعا کے واسطے

متعدد ہوں حفظ الرحمن ہر بلا کے واسطے
ہو ہمارے واسطے شام محرم صبح عید
جلوہ گر ہوں پھر نئے انداز سے احمد سعید
ہند و پاکستان دونوں بن گئے ماتم کدے
کام کچھ لدھیانوی پیر جواں ہمت سے لے
خوف جو کھاتا نہ تھا انگریز کی سنگین سے
تو مدد لے اس جری انسان نور الدین سے
کام میں تیرے تجھے دیں گے مدد ذاکر حسین
ان کی باتوں کا اثر لیں گے یقیناً جانبین
ساتھ دیں گے آخری حد تک ترا مفتی عتیق
مولوی طیب بنیں گے راہ و منزل کو رفیق
لے اعانت کچھ سعید صاحبِ مہرباں سے
کچھ مدیرِ الجمعیۃ مولوی عثمان سے
ختم ہو جائے کسی صورت سے یہ دورِ عجیب
لائیں جنبش میں قلم اپنا پروفیسر مجیب
فرقہ واریت کے دشمن قومیت کے دلکش مبیں
دیں مدد کو قلم سے ڈاکٹر عابد حسین
سامنے کوئی ہلال احمد کے آ سکتا نہیں
اور سے کوئی آنکھیں ملا سکتا نہیں
ملک میں پھیلی ہوئی ہے ہر طرف اک ابتری
اٹھ کھڑے ہوں کام کو سید محمد جعفری

بھائی چارہ کا سفینہ پڑگیا گرداب میں
ڈاکٹر کچلو سے کچھ امداد لے پنجاب میں
اور بھی اک آدمی ہے عزم وہمت کا دھنی
پیکر ایثار جس کا نام ہے عبد الغنی
سید عبد اللہ ہیں تیری حضوری کے لئے
بمبئی کو چھوڑ دے لیلیٰ نوری کے لئے
مولوی اظہار ڈلیسہ میں کریں کچھ انتظام
تاکہ پہونچائے وہاں بھی تو اخوت کا پیام
بھیج سی۔ پی میں اسے جس پہ ہو تجھ کو اعتماد
تاکہ قائم ہو وہاں بھی شاخ "بزم اتحاد"
مولوی سلطاں حسن کو بھیج دے اجمیر میں
اور ادھر مہدی حسن موجود ہیں راندھیر میں
اور پھر موجود ہیں اجمیر میں عبد الشکور
انجمن کی روشنی پہونچائیں گے یہ دور دور
لے مدد بنگال کے نوشیر علی سے کام میں
طیب اللہ کام کو موجود ہیں آسام میں
ہند کلکتہ کے ناظر ساتھ دیں گے شان سے
اور امید تعاون ہے محمد جان سے
اپنا اک بوڑھا مجاہد بھی وہیں پر ہے مقیم
جسکو سب کہتے ہیں حافظ مولوی عبد الحلیم
اور پھر مولانا قاری رحمت اللہ ہیں وہیں

جن سے اچھا کارکن مجھ کو نظر آتا نہیں
ڈاکٹر محمود کر کچھ وقت دیں تحریک کو
صبح میں تبدیل کر دیں یہ شب تاریک کو
کام میں ان کے کریں قیوم انصاری مدد
منت اللہ ساتھ ہوں ہمراہ ہوں عبد الصمد
ختم ہو شام محرم جلوہ گر ہو روز عید
مولوی عبد الصمد کے ساتھ ہوں عبد الحمید
بیکسوں کی دستگیری کو سمجھ کر فرض عین
ساتھ دیں گے لازمی پھلواروی احمد حسین
مولوی الیاس صدیقی کریں رانچی میں کام
اور معین الحق پلاموں میں کریں کچھ انتظام
مولوی نور الحسن پھلواردی ہوں مستعد
دست نور اللہ میں ہو پرچم ترک جمود
اور در بھنگہ سے اٹھیں مولوی عبد الودود
اور بھی اک شخص ہو چمپانگر میں خوش خرام
نام میں جن کے علی آتا ہے پہلے پھر امام
ظل نور اللہ میں یہ مشق جانبازی کریں!
اور مدد تحریک میں منظور اعجازی کریں
پھر تو صوبے کی فضا انگڑائیاں لینے لگے
ہر زمیں نفرت سلگ اٹھے دھواں دینے لگے
صوبۂ مدراس کا لیتا ہوں میں عزت سے نام

کیونکہ ہی مدراسیوں کا ہے دل میں احترام
ہو رہی تھی ملک کی ہر چیز جب زیر و زبر
تھی نظر مدراسیوں کی انقلاب وقت پر
انقلاب تند خو کی رو میں جو بہتے نہیں
عزت و عظمت میں جو پیچھے کبھی رہتے نہیں
جل رہا تھا چونکہ سینے میں چراغ احساس کا
اس لئے اونچا نظر آتا ہے سر مدراس کا
ہم کو اپنے عہد کی تجدید کرنی چاہیئے
ملک کو مدراس کی تقلید کرنی چاہیئے
صوبۂ مدراس میں ہیں مولوی عبد الحمید
ان سے ہونی چاہیئے اس باب میں گفت و شنید
ان کی کوشش سے پہونچ سکتا ہے گھر گھر میں پیام
کیونکہ ان کی ہی ادارت میں ہے جاری ہے الکلام
اور مولانا محی الدین ہیں کرنول میں!
کام کر سکتے ہیں جو تاریک تر ماحول میں
مولوی مقبول احمد ہوں بیابانی کے ساتھ
پھر تو ہو مدراس میں ہر کام آسانی کیساتھ
مولوی رزاق بھی مدراس میں ہیں نیک نام
اور دیدہ ؤ دلی میں موجود ہیں عبد السلام
ذکر میں کیونکر کروں اس میں غفار کا
نام لے کس منہ سے گا تیغ جوہر دار کا

بھینٹ سرحد چڑھ گیا انگریز کی اسکیم پر
لعنت اس تقسیم پر پھٹکار اس تقسیم پر

آج کہ جب بادشاہ خاں یاد آتے ہیں مجھے
بے بسی پر اپنی وہ گھنٹوں رلاتے ہیں مجھے

دیکھتا ہے ان کو جب میرا تصور مضمحل
کیا کہوں فرطِ عقیدت سے تڑپ اٹھتا ہے دل

ورنہ وہ اور اس کی اس حالت پر کوئی آنسو بہائے
موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جو مسکرائے

زندہ باد اے شہر سرحد شہر سرحد زندہ باد
اب بھی گویا دشمنوں سے تو ہے مصروف جہاد

تیرا قصہ قصہ خوانی کی زمیں کو یاد ہے
قید میں تو ہے مگر تیرا وطن آزاد ہے

دشمنوں کی دسترس سے تیری ہستی ہے بلند
آج گرچہ تو وطن کے قید خانے میں ہے بند

فوج پہونچے اس کے آگے راست چپ کرتی ہوئی
موت بھی آئے گی جس کے سامنے ڈرتی ہوئی

اک تبسم سا لب قیوم پر رخشندہ ہے
ورنہ وہ سارے جہاں کے سامنے شرمندہ ہے

دورِ آزادی میں جانِ حریت ہے جیل میں
اے خدا تیرا بھی کیا کچھ ہاتھ ہے اس کھیل میں

ہے مری نذرِ عقیدت سرخ پوشوں کے لئے

ماہی بے آب ہوں ان سرفروشوں کیلئے
لائیں راہ راست پہ جو ہوں وہاں اسباب کد
ڈاکٹر خاں اور بلوچستان کے عبدالصمد
کام لے یو-پی کے اندر حافظ ابراہیم سے
جن کا ایک گونہ تعلق ہے ترقی اسکیم سے
کوئی کارِ مشکل ڈ محمود شروانی سے لے
اور مدراس کام میں انصار ہروانی سے لے
ہے بنارس اور علی گڈھ سے اعانت کی امید
آئیں گے دونوں جگہ سے ایک اک عبدالمجید
اور اعظم گڈھ میں ہیں سید سلیمان و سہیل
چھانٹ دیں گے یہ دلوں سے مسلم و ہندو کا میل
کام کچھ اپنا بقاء اللہ عثمانی سے لے
اور مدد تنظیم میں منظور نعمانی سے لے
کام لے صبح بنارس سے اودھ کی شام سے
یعنی کچھ اسحاق سے کچھ اختر الاسلام سے
مشرقی یوپی میں نکلے کام کی اچھی سبیل
دیں اگر امداد سابق کاؤنسلر خواجہ خلیل
ن احمد پس چہ بالا کر د" کے عنوان سے!
اس قدر نکل آئے وطن طوفان سے
ہمنوا ہوں گے فتح گڈھ کے وکیل عبدالجلیل
تیری دمسازی کریں گے لازماً قاضی عدیل

کام میں امداد دیں گے ڈاکٹر عبد العلی
ہیں کام کو اسحاق صاحب سنبھلی
لکھنؤ سے عظمت اللہ اور انیس احمد کو لے
کار موزدں کوئی مولانا بشیر احمد کو دے
فرقہ واریت کا سورج دم بدم ڈھلتا رہے
لکھنؤ میں آل احمد کا قلم چلتا رہے
دیں مدد کچھ لکھنؤ ایوان کے سابق حکیم
یعنی بستی کے پلیڈر مولوی عبد الحلیم
ساتھ دیں گے سچے دل سے تیر اشاید فاخری
یہ وہ موسیٰ ہیں کہ جن سے کانپتا ہے
ہو رہی ہے ناؤ آزادی کی طوفاں سے قریب
ایسی حالت میں مدد دیں گے پروفیسر حبیب
حامد الانصاری غازی سے مدد لے کام میں
رہتے ہیں ثابت قدم یہ گردشِ ایام میں
غیر ممکن ہے ہٹانا ان کو اپنی راہ سے
فرقہ پرست تھرتھراتے ہیں حیات اللہ سے
فرقہ واریت جھکا دے گی ادب سے اپنا سیں
آئیں گے میدان میں جب مولوی سید انیس
ختم ہو جائیں گے دم بھر میں دلوں کے پیچ و خم
جب اٹھائیں گے پروفیسر رشید احمد قلم
کر نہیں سکتے کبھی پہلو تہی امداد سے

لے ریاض الدین احمد کو الہ آباد سے
خواجہ اظہر کو سہارنپور سے لینا ضرور
اور منظور البنی اک آدمی ہیں ذی شعور
نامزد کن از مرادآباد فخر الدین را !
وزگیا ایضاً دازساگر سراج الدین را !
ہلدوانی میں حکیم اللہ اییٹہ میں ظفر
اور متھرا شہر میں عبد الغنی ہیں با اثر
غیر مسلم ہم سے نکتے ہوں توازن کیلئے
سیکڑوں تیار ہیں ہے تعاون کے لئے
پانصد اشخاص پر ہو مشتمل یہ کارواں
اک ادائے نو سے ہو پھر جانب منزل رواں
کام لے ہر ہر رسالے سے ہر ایک اخبار سے
قوم کی کشتی نکل آئے گی خود منجدھار سے
ہے مدد احمل حقیقت ایثار تصویر سے
آئینہ مشعل اجالا روشنی تنویر سے !
کام لے منظر سے ساغر سے جگر سے جوش سے
اختر و انور روش سے نکہر سے اور مہوش سے
نازش و انصار و آ احمق و بزم و شرار
کامل و سرشار و کوثر آصف و یا ہر نثار
شاکر و حماد و محفوظ اور حمید و کاظمی سے
قاسم و اخلاق و ماجد اور حبیب اعظمی سے

یونس و سجاد و ایوب و فضیل و ہاشمی
احمد و محمود و یوسف اور وحید قاسمی
رو کتے ہیں نام لینے سے قوافی اور ردیف
ورنہ ہیں معلوم مجھ کو سیکڑوں اسم شریف
راہ میں حائل ہے بحر فاعلاتن فاعلات
ورنہ خیمہ زن نہ رہتی شاخِ آہو پر برات
الغرض تیار ہے یہ کارواں تیرے لئے
گوش بر آواز ہے ہندوستاں تیرے لئے
قافلہ سالار! در قیصر حکومت تابہ کے
نوح کشتی یا قلمدان وزارت تابہ کے

۵۸۶

مولانا...... آزاد

--------- ۱۹۲۵ء

یکم جنوری ۱۹۲۵ء

سلیم پور ہاؤس ــــ لکھنؤ

میرے بھائی ہندوستان کے آئینی مسئلہ کے بارے میں میری نپی تلی رائے ہے کہ آنیوالے انتخاب میں ہندوستان کو آزادی تو نہیں مل رہی لیکن میرا قطعی یقین ہے کہ ہم ہندوستان کی آزادی کے قریب ہو جائیں گے۔ لیکن آزادی سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد قائم ہو۔ بلکہ کسی آئینی اتحاد کے ہندوستان کی آزادی بے معنی ہو کر رہ جائیگی۔ میرے نزدیک مسلم پارلیمنٹری بورڈ میں اگر مع مسلم لیگ کے تمام جماعتیں شریک ہو جائیں۔ تو الکشن کے بعد کانگریس کیلئے آئینی اتحاد کا مسئلہ آسان ہو جائیگا۔

سلیم پور ہاؤس میں مولانا آزاد۔ ایک گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور بے نیازی سے سگریٹ پر سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ مولانا آزاد نے پنڈت پنت کی موجودگی میں چودھری خلیق الزماں، نواب اسمٰعیل خاں۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی صدر مجلس احرار ہند اور مولانا شبیر سیٹھ مرحوم رکن ورکنگ کمیٹی جمعیتہ علماء ہند کے سامنے تقریر کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں کمرے کے ایک کونے میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہندوستان کے اس عظیم الشان انسان کی یہ باتیں غور سے سن رہا تھا مولانا آزاد کی خدمت میں میری یہ پہلی حاضری تھی میں اپنے والد محترم مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے ہمراہ کوئی آٹھ دن تک مولانا آزاد کی خدمت میں رہا۔ مولانا آزاد جب گفتگو فرماتے۔ تو ایسا معلوم ہوتا۔ کہ ادبی الفاظ مولانا کے محتاج ہیں۔ اور مولانا کو زبان و بیان پر ایسی قدرت حاصل تھی۔ جس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کے دماغ میں الفاظ ڈھل کر نکلتے تھے۔ اس آٹھ روزہ قیام کے دوران میں مولانا کو جی بھر کر دیکھتا رہا۔ اور ان کی سب ہی گفتگو سنی۔ لیکن اس کے باوجود باربار دل میں یہی خیال آتا رہا۔ کہ ہے

دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھوں۔

یکم نومبر ۱۹۳۷ء

کوچہ چیلان آصف علی ہاؤس۔ دہلی

والد صاحب قبلہ نماز ظہر سے فارغ ہوئے ہی تھے۔ کہ ان کو دہلی سے تار ملا۔ دہلی پہونچیے۔ آزاد۔ مولانا آزاد کا تار پڑھتے ہی والد قبلہ مجھے ہمراہ لیکر دہلی روانہ ہو گئے۔ دہلی میں انجمن سیف الاسلام میں قیام رہا۔ یکم نومبر کی صبح آٹھ بجے مولانا کی خدمت میں پہونچے۔ اس میٹنگ میں بہار سے ڈاکٹر سید محمود۔ بمبئی سے سید عبداللہ بریلوی۔ کلکتہ سے مولانا نوشیر علی، جمعیت علماء ہند کی طرف سے مفتی کفایت اللہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی حضرت مولانا حفظ الرحمٰن شامل تھے۔ مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ مسلم لیگ نے ہندوستان میں مسلمانوں کے مطالبات کو ایک نئی شکل دی ہے۔ مسلم لیگ کے رہنما کسی ایک اصول پر گفتگو کرنے پر تیار نہیں اسلئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے بارے میں ایک واضح بات سامنے آجائے۔ مولانا آزاد نے مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

تمام صوبوں سے مسلم لیگ اور کانگریس کی کشمکش کی خبریں آرہی ہیں۔ اس سے ہندو اور مسلمانوں میں نفرت بڑھ رہی ہے۔ اگر ہندو مسلم منافرت کو نہ روکا گیا۔ تو ایک دن ایسے حالات سامنے آئیں گے۔ کہ جو ہندو یا مسلمان یا یوں کہیئے کہ کانگریسی اور مسلم لیگی رہنماؤں کے قابو میں نہ رہیں گے۔ میری یہ بہت پرانی رائے ہے۔ کہ ہندوستان کی آئینی آزادی ہو یا مکمل آزادی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔

جہاں تک کانگریسی حکومتوں کی عصبیت کا تعلق ہے۔ وہ اگر بقول مسلم لیگ کے درست بھی ہو۔ تب بھی بحیثیت مسلمان کے مسلمانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ خود مشتعل نہ ہوں۔ کیونکہ اقلیت کا اشتعال اکثریت کے انتقام کی صورت میں نمودار ہوتا ہے

میری رائے یہ ہے کہ مسلمان جن صوبوں میں اقلیت میں ہیں. وہاں وہ تدبر حکمت اور صبر سے کام لیں۔ انگریزی حکمت عملی تو یہ ہے کہ جو مسلمانوں کے جمہوری وجود اور آئینی حقوق کو فرقہ وارانہ شکل میں ہی ظاہر کرے۔ اس بارے میں بڑی ذمہ داری تو اکثریت کی ہے کہ وہ جمہوری طرز حکومت میں اقلیت کو مطمئن کرے. کیونکہ کوئی جمہوری حکومت اقلیت کو مطمئن کئے بغیر نہیں چل سکتی ہے۔ اور نہ چلائی جا سکتی ہے۔ کانگریس نے اپنا نقطہ نظر یہی بنایا ہے۔ کہ وہ اقلیت کے پورے حقوق کی گارنٹی دے۔ گفتگو کے اس مرحلہ پر ڈاکٹر سید محمود نے فرمایا. کہ کانگریس کے ہندو لیڈر روز لیگ نہ ایک بیان ایسا دیتے ہیں جس سے حالات میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ آخر کانگریس مسلمانوں کے بارے میں آزاد خیال جماعتوں سے معاہدہ کیوں نہیں کرتی۔ مولانا محمد میاں فاروقی الہ آبادی نے فرمایا کہ کانگریس کے ہندو رہنماؤں میں جمہوری حکومت سے زیادہ ہندو حکومت قائم کرنے کا خیال نمایاں ہو گیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے جمیعتہ علماء کے فارمولے کی تشریح کی یہ مجلس کوئی تین گھنٹے جاری رہی۔ اور پھر شام کیلئے ملتوی ہو گئی۔

حضرت مولانا آزاد کی خدمت میں میری یہ دوسری حاضری تھی۔ آج کی گفتگو میں مولانا آزاد نے یہ بھی انکشاف کیا. کہ آج دو بجے سر سکندر حیات خاں وزیر پنجاب ملنے کے لئے آئیں گے۔ تاکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے سلسلہ میں بات چیت ہو سکے۔

۱۸ر جولائی ۱۹۴۵ء
وائسرائے ہاؤس شملہ

۸ر جولائی کی صبح کو رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مولانا آزاد سے وائسرائے ایگل لاج میں ملے۔ مولانا آزاد نے اس ملاقات میں فرمایا

اگر برطانوی گورنمنٹ کسی باعزت سمجھوتے پر رضامند نہ ہوئی تو کانگریس کو نئی تحریک جاری کرنی ہوگی۔ اس گفتگو میں مولانا آزاد نے اپنے ساتھیوں کی کمزوری کیطرف بھی اشارہ کیا۔

میرے بھائی لوگ تو اسوقت سمجھوتے کیلئے بے تاب ہیں۔ خواہ وہ سمجھوتہ کیسا ہی ہو۔ اور کسی بھی بنیاد پر ہو۔ لیکن میں نے دیول صاحب سے کہہ دیا کہ سمجھوتہ اگر ہمارے خلاف ہوگا۔ تو اسے کانگریس قبول نہ کرے گی۔ اس موقعہ پر مولانا حبیب الرحمٰن نے سر فیروز خاں کا یہ پیغام دیا۔ کہ آپ مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے برطانیہ سے سمجھوتہ کر لیں۔ اس پر مولانا نے فرمایا۔ کہ میرے بھائی سوال دیول کی مخالفت کا نہیں۔ بلکہ ہندوستان کے قومی اتحاد کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ برطانوی گورنمنٹ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے۔ وہ کس انداز سے ہندوستان کے آئینی مسئلہ کو حل کرنا چاہتی ہے۔ میرے سامنے یہی مسئلہ زیر غور ہے دیول کی گفتگو اور اس کا تعاون اس حد تک میرے سامنے ہے۔ کہ وہ پرائیویٹ ملاقاتوں میں بہت کھل کر ہندوستان کے مسائل پر بات کر رہا ہے۔ اگر دیول کو یہ مسئلہ یونہی طے کرنا ہوتا تو میں اور دیول آج یہ مسئلہ طے کر چکے ہوتے۔ لیکن دیول گورنمنٹ برطانیہ کی رائے اور مشورے کے خلاف کچھ کرنے سے مقدور ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے میری ملاقاتیں ۱۹۳۳ء سے شروع ہوئیں۔ اور دہلی میں آخری دم تک جاری رہیں۔ میری ملاقاتوں کی کل تعداد ایکسو تیس ہے۔ ان ملاقاتوں میں میں نے سیاسی، سماجی۔ ادبی۔ معاشی۔ معاشرتی اقتصادی، تمدنی، تہذیبی۔ عمرانی، انقلابی۔ اور تاریخی موضوعات پر ان

کے خیالات میں یقین کے ساتھ اپنی شنید و دید کے مطابق یہ کہہ سکتا ہوں۔
کہ انسانی اور مدنی زندگی کا کوئی موضوع ایسا نہیں تھا جس پر مولانا کو عبور
حاصل نہ ہو۔ وہ جس موضوع پر بھی بات کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ وہ اس بارے میں نئی تحقیقات بیان کر رہے ہیں جو اس سے پہلے
در بطن تاریخ ہی میں تھی۔

ان کی گفتگو کا انداز نرالا تھا۔ ان کی تہذیبی اور تمدنی زندگی روایتی
بادشاہوں کی زندگی کا مزاق اڑاتی تھی۔ ان کا کوئی مخالف ان کی مجلس میں
کبھی بھی بے تکلف نہ ہو سکا۔ اور نہ ہی ان مجلس میں کسی کی یہ جرأت ہوئی کہ ان
کے دلائل کے جواب دے سکے۔

وہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کا نام اپنی سیاسی گفتگو میں پیر سیاہ
کی حیثیت سے لیتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی اور ہندوستان
کی تقسیم کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا تھا وہ اس پر مضبوطی سے قائم
رہے۔ اور آخر دم تک ان کا یہی خیال رہا۔ کہ ہندوستان کی تقسیم سے ہندو
اور مسلمانوں کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔

عزیز الرحمٰن جامعی

ختم شد

مولانا محمد برکت اللہ بھوپالی

ہندوستان کی جنگ آزادی کا ایک سپہ سالار

ہندوستان کی حکومتِ موقتہ کا وزیر اعظم ۔ ہفت زبان بیباک صحافی ۔ جید عالم انقلاب مجسم اور مفکر اعظم شیخ جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد ہو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی انقلابی تحریک ہو لالہ ہر دیال کی امریکہ میں غدار پارٹی ۔ ریشمی رومال تحریک ہو۔ راجہ مہندر پرتاپ کی حکومت موقتہ ہو یا مسئلہ خلافت ۔

مولانا محمد برکت اللہ بھوپالی ہر تحریک میں زندہ جاوید تحریک مجسم مشیر خصوصی اور نمائندہ اول کی صف میں نظر آئیگا جس کی زندگی ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی ۴۵ سالہ کھلی کتاب ہے ۔ جو اپنی آخری عمر تک آزادی وطن کے لئے برسرِ پیکار رہا۔

جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کا بگل بجا اور منگل پانڈے نے جنگ آزادی کی پہلی گولی چلادی تو بھوپال کے ضلع نوب میں قصبہ سیہود میں ولی شاہ اس کے بھائی عارف شاہ اور ساتھی مہابیر اور رمجولال نے کمپنی سرکار کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور متوازی حکومت سپاہی بہادر قائم کر کے اپنا انقلابی پرچم لہرایا گو بعد میں ان کے ۴۹ ساتھی برطانوی سامراج کی گولیوں کا نشانہ بنے اور ضلع مشرق میں گدھی آینہ پانی کا جاگیردار میاں فضل محمد خاں برطانوی سامراج کے مدمقابل سر سے کفن باندھ کر برہنہ شمشیر نکل کھڑا ہوا ۔ اور بالآخر قلعہ راحت گڑھ کے دروازہ پر خوشی خوشی پھانسی کے پھندے میں سر دیکر جام شہادت نوش کر گیا ۔

اور پھر بھوپال کی خاک سے ایک اور مجاہد مولانا برکت اللہ بھوپالی شیخ جمال الدین افغانی سے بھوپال میں ۱۸۸۲ء میں انقلابی توانائی حاصل کر کے انقلاب مجسم بن کر اٹھا اور ۴۵ سال کامل اپنی آخری سانس تک زندہ تحریک حریت بنا رہا ۔ خدا کا نام لے کر میدان عمل میں کود پڑنے والے پروفیسر مولانا برکت اللہ بھوپالی جیسے عظیم اور جلیل القدر مجاہد جید عالم سراپا انقلاب اور باغی اعظم کی زندگی کے عظیم کارناموں کو کسی مختصر مضمون میں سمیٹنا یا کوزہ میں بند نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کیلئے تو علیحدہ سے ہی ان کی داستان حیات

ایک کتاب کی صورت میں عنقریب طباعت کے مراحل و مدارج طے کر کے منظر عام پر آنیوالی ہے۔ یہاں تو صرف ایک سرسری اور وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ اس مجاہد اعظم کی انقلابی سرگرمیوں کا ایک خاکہ ہدیہ ناظرین ہے۔

مولانا محمد برکت اللہ بھوپالی نے آزادی وطن کی خاطر اقوام کی رائے عامہ کو ہندوستان کے حریت پسند اور انقلابی سرفروش مجاہدین کے ہم خیال کرنے کی خاطر کرہ ارض کا دو بار سے زیادہ طواف کیا جو لندن اور لورپول سے نکل کر نیویارک ٹوکیو، ہانگ کانگ، شنگھائی، سنگاپور، برلن، پیرس، واشنگٹن، سانفرانسسکو سیکرامنٹو، قسطنطنیہ کابل، ہرات، ماسکو، زیورخ، بروسیلز، کھنکال ڈالا بالآخر اسی آرزو اور امید میں سان فرانسسکو کے ایک ہسپتال میں ۲۷ ستمبر ۱۹۲۷ء کی رات میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور غلامی میں جکڑے ہوئے وطن سے ہزاروں میل دور یہ تھکا ہوا مجاہد سو گیا کہ جب آزادی کی نمود سحر ہو تو مجھے جگا لینا اور میرے جسد خاکی کے ساتھ سیکرامنٹو لاکر وعدہ کیا گیا ہے اور پھر تویل کے قبرستان میں سپرد خاک کرتے وقت عہد کیا گیا ہے اس کو پورا کر دینا یہ خاک میرے وطن پہونچا دینا دوستوں کے وعدہ کیا قول و قرار ہوا وطن بھی آزاد ہوا لیکن آج انیس سال بیت جانے پر بھی تو کسی کو خیال تک نہ آیا کہ کوئی محو خواب ہے اسے جگا دیں اپنا قول و قرار بھول گئے۔ وعدہ فراموش کر دیا۔

آج برکت اللہ بھوپالی کی روح بیقرار ہمارے ساتھ ہے۔ چاہے اس کا جسد خاکی ہم سے دور بہت دور ہے لیکن ایک وقت ایسا آئیگا کہ اسکی خاک کو اس کے آزاد وطن جمہوری وطن کی خاک میں گھل مل جانیکا موقعہ اور حق دیا جائیگا۔

ابتدائی حالات

۱۸۵۸ء کے آخر میں مولوی محمد شجاعت اللہ نامی ایک شخص مع اہلیہ بدایوں سے

حوادث زمانہ کا شکار ہو کر بھوپال میں وارد ہوئے ۔ یہ زمانہ عہد حکومت تو نواب شاہجہاں بیگم کا تھا لیکن اصل حکومت ان کی والدہ ماجدہ نواب سکندر بیگم بحیثیت مختار سلطنت کر رہی تھیں جو بعد میں ۱۸۶۱ء بیٹی کی جگہ خود بحیثیت فرماں روا تسلیم کی جا کر مسند نشین ہوئیں اور نواب شاہجہاں بیگم اپنی والدہ کے حق میں تخت سے دستبردار ہو کر ان کی ولی عہد مقرر ہوئیں ۔

مولوی محمد شجاعت اللہ کو چند ہی روز میں ملازمت مل گئی اور وہ نواب سکندر بیگم کے تعمیر کردہ مدرسہ سیہور کی مدرسی پر مامور ہو کر اطمینان کا سانس لے سکتے پھر حالات نے کروٹ بدلی اور سیہور سے تبادلہ ہوا تو محلہ چھاونی دلاتیان میں ایک خس پوش مختصر سے مکان میں سکونت اختیار کی جو مولانا آزاد سنٹرل لائبریری کے احاطہ کی شمالی فصیل کے قریب واقع تھا ۔ یہیں اس سپاہی منش کے گھر ایک لڑکا اور پھر ایک لڑکی پیدا ہوئی ۔ اور یہ لڑکا بڑا ہو کر پروفیسر مولانا محمد برکت اللہ کہلایا ۔

یہ گدڑی کا لعل اس جگہ پیدا ہوا جہاں آج آزاد ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال میں ٹھیک اس مکان کے مدّ مقابل فصیل کی شمالی جانب لب سڑک میونسپل کمیٹی کا کچرا گھر ہے ۔ اور اہل محلہ جب کچرا اڈا لتے ہیں تو آدھا فصیل کے اسطرف اور آدھا فصیل کے اس طرف جہاں ہندوستان کی آزادی کا روشن مینار پیدا ہوا کرتا رہتا ہے ۔ لیکن آج بھی کسی کو یہ احساس نہیں کہ یہ کس کا مقدس مقام پیدائش ہے ۔

تعلیم و تربیت

مولانا محمد برکت اللہ بھوپالی ۱۸۵۹ء کے اوائل میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم نو دس سال کی عمر تک اپنے والد محمد شجاعت اللہ صاحب سے پولیس چوکی ہندی

والی محلہ چھاؤنی دولاتیان میں جہاں ان کی ڈیوٹی تھی حاصل کرتے رہے۔ پھر مدرسہ سلیمانیہ میں تعلیم حاصل کی اور شہر بھوپال کے علماء و فضلاء کے درس میں بھی شریک ہوتے رہے ریاست بھوپال میں جب ۸ ر اکتوبر ۱۸۴۸ء کو نواب سکندر بیگم کے وفات کے بعد نواب شاہجہاں بیگم کو بحیثیت فرماں روا تخت نشین ہونیکا موقعہ ملا تو انہوں نے تعلیم عام کی جانب خاص توجہ کی اور مارچ ۱۸۵۱ء میں باقاعدہ اعلان جاری کر کے ملازمان ریاست اور عوام کو اپنے بچوں کو تعلیم مدارس سرکاری کی ترغیب دی اور مدرسہ سلیمانیہ کا اسٹنڈرڈ ایک مشرقی دارالعلوم کا ہوگیا اس طرح دس سال میں عربی و فارسی کا ایم۔ اے اور میٹرک تک انگریزی کا انتظام ہوگیا۔ اور طلباء کو تعلیمی وظیفے بھی دیئے جانے لگے۔

الغرض محمد برکت اللہ بھوپالی اپنی تعلیم کے سلسلہ میں موتی مسجد کے مشرقی دروازے کے بالائی حجرے میں رہنے لگے۔ ان میں تحصیل علم کے بے پناہ ذوق دیکھ کر سرکار کی جانب سے دس روپیہ ماہوار مقرر کر دیا گیا۔

مگر یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب نواب سید صدیق حسن خاں خستہ حال پہلی بار بھوپال آئے تو اسی حجرے میں قیام پذیر ہوئے اور ترقی کر کے شوہر بھوپال ہو گئے اور اس حجرے سے نکل کر یہ سپاہی زادہ حکومت موقعہ ہند کا وزیر اعظم بنا۔

موتی مسجد کے اس حجرہ میں رہ کر انھوں نے مولوی عبداللہ پنجابی اور مولانا محمد عمر شاگرد مولانا صہبائی دہلوی سے فارسی کی تکمیل کی۔ اور ریاضیات میں مولوی ہادی حسن سے استفادہ کیا۔ جو اپنے وقت کے مشہور و معروف مدرس ریاضی تھے۔ اور کے معقولی اور منقولی کتابیں علاوہ مدرسہ سلیمانیہ شہر کے مشہور و معروف علماء و فضلا مثل مولانا سید انوار علی اور مولانا یوسف علی سے پڑھیں۔ اور مولوی سید ذوالفقار احمد نقوی سے بھی فیض حاصل کیا۔ نیز حافظ عبدالعزیز نائب مفتی شہر سے

مسجد ترجمہ والی میں اور حدیث شیخ حسن عرب سے حاجی صاحبہ کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ اور منطق وفلسفے بھوپال کی مایہ ناز شخصیت قاضی عبدالحق صاحب سے اور انگریزی ماسٹر فیاض الدین عرف میاں سراج مہتمم شہ خانہ خاص سرکار عالیہ ومنتظم موتی محل کے حکم سے موتی مسجد کے حجرہ سے موتی محل کے سب سے اوپر کے ایک مختصر کمرہ میں رہنے لگے. کیونکہ آپ کے والد مرحوم جو ملازم پولیس تھے ان کی یہیں ڈیوٹی رہتی تھی۔

لیکن جب مولوی سراج الدین موتی محل کے انچارج نہ رہے تو مولانا برکت اللہ کو بھی موتی محل چھوڑنا پڑا. اور آپ میاں نور محمد خاں جاگیر کے یہاں رہنے لگے اور حلقہ ذکر وتسبیح کا سلسلہ شروع کر دیا۔

۱۸۸۷ء کے لگ بھگ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے درس دینے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اور نور محل میں آپ کیلئے ایک کوٹھری رہنے کیلئے لی گئی کیونکہ ابو النصر سید محمد علی حسن خاں صفی الدولہ حسام الملک جو نواب صدیق حسن خاں کے چھوٹے صاحبزادے تھے وہ اسوقت بھوپال کے ڈائریکٹر تعلیمات تھے جیساکہ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے لیورپور سے اپنے زمانہ پروفیسری میں اسکا تذکرہ ان الفاظ میں کیا تھا۔

میں اب وہ برکت اللہ نہیں ہوں جو آپ کا دس روپے کا ملازم برکت اللہ تھا جس بنگلہ میں میں رہتا ہوں اور جو تنخواہ مجھے ملتی ہے اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ اسوقت میرے پاؤں میں پچاس روپے کا جوتا ہے. مولانا برکت اللہ بھوپالی کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی تھی لیکن ان سب میں قابل ذکر شاگرد جنہوں نے علوم عربی پڑھے وہ سید نصرت الدین عبد القادر ناظم بخاری تھے. جو اردو فارسی کی ۴۳ کتابوں کے مصنف ومولف ہیں۔ اور ان کی ۱۳ کتابیں طبع ہوئی ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ ناظم بخاری نے اپنے حالات بخارا سے ہندوستان بھوپال وارد ہونے تعلیم حاصل کرنے اور ملازمت وغیرہ کو فارسی میں نظم کیا ہے اس منظوم

تذکرہ میں ۷۰ اشعر مولانا برکت اللہ بھوپالی پر کہے ہیں جو ۱۸۹۶ء کے حالات کا جائزہ ہے۔ قلمی نسخہ)

شیخ سید جمال الدین افغانی

بھوپال میں اور مولانا برکت اللہ بھوپالی

جسوقت مصر میں اعرابی پاشا نے انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھائی تو شیخ جمال الدین افغانی جو اسوقت حیدرآباد دکن میں مقیم تھے گرفتار کر کے کلکتہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن ۱۳ ستمبر ۱۸۸۲ء کو کبیر کے معرکہ میں اعرابی پاشا کی شکست اور گرفتاری نے انگریز کو مطمئن کر دیا۔ شیخ کلکتہ کی نظر بندی سے آزاد ہو کر افغانستان گئے اور چند ماہ بعد یورپ جاتے ہوئے ہندوستان آئے تو گوالیار ہوا دہ سیہور ہوتے ہوئے بھوپال پہونچے اور قاضی عبدالحق صاحب کے مہمان رہے جو مولانا برکت اللہ بھوپالی کے استاد تھے اس زمانہ میں بھوپال میں جماعت اہلحدیث کا بہت زور تھا۔ جو شیخ جمال الدین افغانی جیسے مدبر کے اقوال سمجھنے کی قابلیت نہ رکھتے تھے۔ لیکن قاضی عبدالحق صاحب کا یہ ہونہار شاگرد ان کی صحبت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور وہ بھی دفعتاً بھوپال سے ایسا غائب ہوا کہ پھر دوبارہ بھوپال نہ آیا۔ اور اپنی تمام آزادی وطن کی جد وجہد میں صرف کر دی۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کی سیاسی سرگرمیاں —

(ہمفر انگلستان)

مولانا برکت اللہ نے ۱۸۸۲ء کو اچانک بھوپال کو خیر باد کہا چند روز

ہوشنگ آباد پھر جبلپور میں انگریزی تعلیم حاصل کی اور چار سال بمبئی میں رہ کر
ایم۔ اے کی سند لی اور اعلیٰ تعلیم کے ذوق میں لندن انگلستان پہونچ گئے چند
سال بعد لیورپول چلے گئے اور خود پڑھنے کے بجائے پڑھانے کا سلسلہ شروع کردیا
الغرض لیورپول یونیورسٹی کے اورنٹیل کالج میں عربی کے پروفیسر ہو گئے۔ اور ۵۱۰
روپے تنخواہ ملنے لگی۔ جسوقت لیورپول گئے تو ان کی ملاقات شیخ الاسلام عبداللہ
لوٹیلیم سے ہوگئی اور وہ لیورپول کی مسلم جماعت مسلم انسٹی ٹیوٹ میں شامل ہو گئے۔
اور مسٹر عبداللہ کوئیلیم کے اخبار اور رسالہ کریسنٹ اور اسلامک ورلڈ کی ادارت
میں بھی کام کرتے رہے۔ اور یہیں ۱۸۹۵ء میں ان کی پہلی ملاقات امیر عبدالرحمٰن
والئ افغانستان کے منجھلے شہزادے نصر اللہ خاں سے ہو چکی تھی۔ جو اپنے والد
کی جانب سے ۲۵ ہزار روپے مسلم انسٹی ٹیوٹ لیورپول کیلئے بطور عطیہ پیش کرنے
وارد ہوئے تھے۔ اور یہی ملاقات مولانا برکت اللہ بھوپالی کے اس وقت کام
آئی جب اکتوبر ۱۹۱۵ء میں وہ کابل پہونچے کیونکہ اسوقت سردار نصر اللہ خاں
اپنے بڑے بھائی امیر حبیب اللہ کے دور حکومت میں وزیر اعظم تھے۔ زمانہ
تعلیم میں مولانا برکت اللہ کی ملاقات ہندوستان کے مشہور انقلابی
کرشن ورما سے ہو گئی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ جمال الدین افغانی کی پھونکی ہوئی روح
جسد خاکی میں بے چین و بیقرار ہو گئی اور وہ انقلابی اور بھی سراپا انقلاب بن گئے۔

نیویارک میں درس و تدریس کا سلسلہ

مولانا برکت اللہ دوران قیام انگلستان میں کافی مقبولیت حاصل کر چکے
تھے اور گیارہ سال کے بعد نیویارک چلے اور یہاں بھی ۶ سال تک ۹۹ء سے ۱۹۰۵ء
تک عربی کا درس دیتے رہے۔ اس زمانہ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کو

جب مولانا برکت اللہ کی سیاسی صلاحیتوں کا حال معلوم ہوا تو ان کو اپنے سیاسی مشن کیلئے منتخب فرمایا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی جاپان میں

شیخ الہند بیرونی ممالک میں خفیہ سیاسی سفارتیں بھیجنے کا سلسلہ جاری فرما چکے تھے۔ لہٰذا مولانا برکت اللہ بھوپالی کو دوسرے سیاسی مشن کی نیابت سپرد فرمائی۔ اور وہ ۱۹۰۵ء میں نیویارک روانہ ہو گئے۔ مشن نمبر ۲ کے ارکان کی تعداد پانچ تھی۔ اور مولانا برکت اللہ جو اسوقت پروفیسر برکت اللہ بھوپالی کے نام سے مشہور تھے گو آپ نے انگریزی میں ایم۔ اے امتیاز کے ساتھ اور اردو فارسی اور عربی کے جید عالم تھے لیکن انگلستان میں ترکی جرمنی اور جاپانی زبانوں پر بھی پورا پورا عبور حاصل کر چکے تھے۔ لہٰذا جب ان کا مشن جاپان پہونچا تو ان کو ٹوکیو یونیورسٹی کی اردو کی پروفیسری مل گئی۔ قدم جماتے ہی انہوں نے اسلامک فریٹرنیٹی اخوات اسلام کے نام سے انگریزی اور جاپانی زبان میں ایک اخبار کا اجرا کیا یہ شیخ جمال الدین افغانی کی صحبت کا پہلا اثر تھا۔ جو ان کے جاپان اسلام ازم کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اسی اخبار میں ہندوستان کی غلامی اور برطانوی سامراج کی لوٹ کھسوٹ پر شرح وبسط سے اداریہ اور شدت سے قلم کرنا شروع کر دیئے اور ان کا اثر ہندوستان میں پھیلا برطانوی قونصل مقیم ٹوکیو کے احتجاج پر مولانا برکت اللہ کو ٹوکیو یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا لیکن مالی دشواریوں کے باوجود اور ان کے زبان قلم سے نکلنے والے مضامین مشرق بعید میں دھوم مچاتے رہے اور سلسلہ ۱۹۱۰ء تک جاری رہا۔ برطانوی سامراج کے خلاف جاپانی عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ادھر وہاں مقیم ہندوستانیوں کا انقلابی

مزاج بنانے کے فرائض انجام دیتے رہے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی فرانس میں

مولانا برکت اللہ کی دھوم ہانگ کانگ تا یا شنگھائی تک میں مچ گئی۔ اور لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا' شیخ الہند نے تیسرا مشن چودھری رحمت علی کی قیادت میں جو فرانس میں پہونچا تھا اس میں مشہور انقلابی صحافی رام چندر بھی شامل تھے اور اخبار الانقلاب کا اجرا کر دیا تھا لیکن اس مزید مشن کو جاندار رہنمائی کی ضرورت تھی تو شیخ الہند نے مولانا برکت اللہ کو فرانس بھیج کر اس مشن کو تیز تر بنانے کا حکم دیا چنانچہ وہ اسلامک فریٹرنٹی بند کر کے فرانس پہونچ گئے۔ اور مشن کے اخراجات پورے کرنے کیلئے اس مشن نے رنگ سپلائی کرنے کا کام شروع کر دیا اور ہندوستان میں تمام تاجروں کی بھی رنگ بھیجنے اور اسی ذریعہ سے پیغام رسانی کا سلسلہ جاری کیا اور اخبار انقلاب کے ادارہ کو بھی

مولانا برکت اللہ بھوپالی سان فرانسسکو میں

اور

غدر پارٹی میں شمولیت

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے حکم سے جو تھا مشن امریکہ بھیجا گیا تھا جس سے پہلے چودھری رحمت علی کو بھیجا گیا اور حکم ملا کہ وہ وہاں پہنچ کر مشہور جذبات کا انتظام کریں چنانچہ چودھری رحمت علی نے واشنگٹن میں مکان خریدا اور اسی میں ہوٹل جاری ہو گیا جب یہ مشن لالہ ہردیال کی قیادت

میں ۱۶ افراد پر مشتمل واشنگٹن پہونچا تو چودھری رحمت علی پنجابی پیرس واپس لوٹ آئے اور پھر مشہور و معروف انقلابی لالہ ہردیال امریکہ کی ریاست کیلیفورنیا کے صدر مقام سیکرامینٹو اور سان فرانسسکو وغیرہ میں اپنے مشن کی کامیابی کے لئے سرگرم ہوئے۔

سڈیشن کمیٹی ۱۹۱۸ء رپورٹ جو رولٹ کمیٹی کہلاتی ہے۔ لالہ ہردیال کے متعلق درج ہے کہ یہ شخص ۱۹۱۳ء کو ایک جماعت بنایا اور اخبار کے اجراء کے مراحل طے پائے اور یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو اخبار غدر کا اجراء عمل میں آیا اور ایسوسی ایشن نام غدر پارٹی اور پریس کا نام یگیہ آشرم یعنی دور جدید کے مکتب خیال کا مرکز اب مولانا برکت اللہ بھوپالی جو غدر پارٹی کے قیام سے قبل سان فرانسسکو پہونچ چکے تھے۔ انہوں نے لالہ ہردیال اور پر ... کے ساتھ مل کر امریکہ اور کینیڈا کے متعدد شہروں میں جلسے کر کے ہندوستانی لوگوں میں انقلاب کی مشعل روشن کی اس سلسلہ میں وان کوور وغیرہ کے ... سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ اسٹوریا ASTORIA میں ایک جلسہ لالہ ہردیال کی صدارت میں ہوا جس میں مولانا برکت اللہ بھوپالی جیسے دیگر جہاں گرد مقررین نے بھی انگریزی کے خلاف شعلہ فشاں تقریریں کی اور جب مولانا برکت اللہ نے غدر سنہ ۱۹۱۴ء میں وانکوور کا ہاتھ بٹایا تو اخبار میں کھلم کھلا شائع کرنا شروع کر دیا کہ اٹھو اس وقت تمہارے پاس اتنا وقت نہیں بغاوت کرنے انقلاب لانے کیلئے جان کی بازی لگا دی یورپ میں جنگ چھڑ گئی ہے اٹھو بہادرو جلد کرو یہ تمام ٹیکس دینا بند کرو سارے ہندوستان میں غدر مچا دو۔ ہمیں ایسے بہادر اور سرفروش چاہئیں جو ہندوستان میں غدر مچا دیں اور ان کو تنخواہ موت انعام شہادت اٹھو اپنی آنکھیں کھولو غدر کیلئے چندہ میں توڑے کے توڑے جمع کر دو اور غدر مچانے کیلئے

ہندوستان روانہ ہو جائے۔ اور آزادی وطن کی خاطر اپنی جانیں قربان کرو۔

ڈی نیٹ پولیٹ میں درج ہے کہ ایک کتابچہ جو مشتعلہ انگیز نظموں پر مشتمل تھا غدر کی گونج کے عنوان سے شائع کیا گیا جس کی انیسویں نظم ایک قصیدہ تھی جس میں لیاقت حسین برکت اللہ بھوپالی کی اہمیت سمجھ سادر کرتا بندہ گھوش کرشن ورما ہردیال اور دیگر غدر پارٹی کے رہنماؤں کی تعریف و توصیف کی گئی تھی۔

غدر پارٹی کا ایک جلسہ جو ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۳ء سیکرامنٹو میں ہوا تھا اس میں مشہور معروف انقلابیوں کی تصاویر بھی آویزاں کی گئی تھیں۔ اور جلسہ کو لالہ ہردیال اور مولانا برکت اللہ بھوپالی نے خطاب کیا تھا۔ غدر پارٹی کی شاخیں امریکہ اور کینیڈا کے علاوہ ملایا، ہند، چین، برما، جاپان، جین اور فلپائن وغیرہ میں بھی پھیل گئی۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی جرمنی میں

ایک نوجوان نام چمپکارامن پلے جو زیورچ کے انٹرنیشنل پرو انڈیا کمیٹی کا صدر تھا وہ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں برلن پہونچا اور اس نے وہاں انڈین نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی اور پھر امریکہ سے غدر پارٹی کے اراکین لالہ ہردیال مولانا برکت اللہ بھوپالی تارک ناتھ داس چندر را کے چکرورتی اور ہیرالال گپتا وغیرہ آکر شامل ہو گئے۔ جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ برلن میں مولانا برکت اللہ کی سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ گئیں تو ان کے پرائیویٹ سکریٹری ہربنس رام گیتا جو اسوقت سب سے کم عمر تھے لیکن مولانا برکت اللہ کو جو عمر میں سب سے زیادہ تھے بہت مانتے تھے۔ یہ اس وقت باقیہ حیات ہے اور انہوں

نے مولانا برکت اللہ بھوپالی کے سلسلے میں مجھے کافی مفید معلومات علاوہ راجہ مہندر پرتاپ فراہم کی ہیں۔ راقم الحروف مسٹر بی۔ این داس گپتا ہی نے راجہ مہندر پرتاپ کو پہلی بار مولانا برکت اللہ بھوپالی سے ملایا تھا۔ راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ بھوپالی جرمنی کے فرمانروا ولیم سے ملے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے سلسلے میں ایک جامع منصوبہ بنایا گیا الغرض اول ۱۹۱۵ء میں محمد برکت اللہ بھوپالی اپنے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر ہریندر ناتھ گپتا اور راجہ مہندر پرتاپ نے برلن سے ویانہ بداپسٹ بخارسٹ صوفیہ وغیرہ کے راستے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ اس روز سے سلطان روم وزیر اعظم حلمی پاشا اور غازی انور پاشا وغیرہ سے ملاقات کی پروگرام جیتنے پر دیگر رفقا تو حلب، دمشق، فلسطین، صحرائے سینا، ایران اور وادی خیبر جیسے سفر روانہ ہو گئے لیکن مولانا برکت اللہ بھوپالی اور راجہ مہندر پرتاپ کابل افغانستان کے مشن پر روانہ ہو گئے۔

کابل میں ہندوستان کی حکومت بلوقفہ

متوازی حکومت کا قیام

اب ہندوستان ترکی جرمن وفد کابل روانہ ہوا اور بقول راجہ مہندر پرتاپ ریل کا سفر گھوڑوں کا سفر زیادہ کا سفر گھوڑا گاڑی میں بھی بیٹھنا دریچہ کی سو میل گدھے کی سواری ان تمام مشکلات میں میرے رفیق سفید پوش مولانا برکت اللہ خوشی خوشی تکلیفوں کو برداشت کیا۔ یہ وفد بقول ظفر حسین صاحب ۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہونچا اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مولانا عبید اللہ سندھی کابل پہونچ گئے۔ اس وفد کے اراکین ترکی کپتان کاظم بیگ کے علاوہ جرمن ڈاکٹر فون ہنیگ کپتان واگر نیفٹ

فوخت اور مسٹر دور تھے جیسا کہ پہلے تحریر کیا جاچکا ہے کہ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے سردار نصر اللہ خاں سے جو اس وقت وزیر اعظم تھے۔ لیورپول میں ملاقات ہوئی تھی جو اس وقت بہت کام آئی کیونکہ امیر حبیب اللہ خاں والئ افغانستان انگریز پرست آدمی تھے اس انقلابی تحریک کے سلسلہ میں مشہور ریشمی رومال تحریک کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا الغرض کابل میں ہندوستان کی حکومت موقتہ کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ وزیر اعظم مولانا محمد برکت اللہ بھوپالی وزیر ملک مولانا عبید اللہ سندھی اور خود شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کمانڈر انچیف ہوئے۔ لیکن شریف مکہ حسین کی انگریزوں سے خفیہ سازش کی بدولت ترکی کو ۱۹۱۷ء میں شکست ہونے لگی تو امیر حبیب اللہ خاں والئ افغانستان بہت گھبرائے اور ان لوگوں سے کہا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں جرمن رفقا تو پہلے ہی جا چکے تھے راجہ مہندر پرتاپ مزار شریف چلے گئے جو روسی سرحد سے بہت نزدیک ہے۔ اور مولانا برکت اللہ بھوپالی وزیر اور کپتان کاظم بیگ نے ہرات جانا پسند کیا جو ایران سے بہت نزدیک ہے۔ اسی زمانہ میں روس میں انقلاب برپا ہوگیا۔ اور لال سرکار زار شاہی پر فتح یاب ہوگئی تو لال سرکار نے راجہ مہندر پرتاپ کو ماسکو آنے کی دعوت دی۔ وہاں جانے سے پہلے راجہ مہندر پرتاپ نے مولانا برکت اللہ بھوپالی کو خط لکھا اور انہیں اور کپتان کاظم بیگ کو بھی روس آنے کی اطلاع دی۔

ترک عرب مصالحت کی کوشش

جس وقت لوزان LAUSANNE کانفرنس ہو رہی تھی جو نومبر ۱۹۲۲ء سے جولائی ۱۹۲۳ء تک جاری رہی اس لئے مولانا برکت اللہ بھوپالی وہاں موجود تھے اور انہی کی کوشش سے ترک عرب مفاہمت کا باب کھولنے کی کوشش اس

وقت آگے بڑھی کہ ہاشمی نمائندہ ڈاکٹر نجی لال [illegible] تو ترکی
وزیر خارجہ جنرل غازی رحمت پاشا رہنما النور نے سیفہ دازیر ۴ فروری ۱۹۲۳ء
کو ملاقات کرانے کے باعث مولانا برکت اللہ بھوپالی کی زبردست شخصیت اور کوشش
کا نتیجہ تھی۔ اس ملاقات کا مقصد انگورہ کی جمہوریت ترکی اور عربوں کے درمیان
سابقہ اختلافات بھلا کر اخوت اور ہمسائگی کے تعلقات استوار کرنا تھا لیکن ہاشمی
نمائندہ نے سرکاری راز کو راز نہ رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملاقات کا سارا حال یورپ
کے اخبار میں شائع ہو گیا۔ اس کے علاوہ ہاشمی نمائندے نے برطانوی گورنمنٹ سے
معاہدہ کرنے کیلئے سودے بازی کا رخ اپنایا اس پر انگورہ کی انقلابی جمہوریت ترکیہ
غضبناک ہو گئی اور اس نے اپنی جرأت و استقلال کی بدولت لوزان کانفرنس
میں جی داری کا ثبوت دیکر اپنے حقوق تسلیم کرا لیئے۔

مسئلہ خلافت اور مولانا برکت اللہ

زیورخ (سوئیزرلینڈ) میں رہ کر مولانا برکت اللہ نے انگریزی میں ایک
کتاب خلافت لکھی جسکا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۴ء اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں شائع
ہوا جسکا پیش لفظ عبداللہ یوسفی صاحب مقیم (انگلستان) نے ۷ اگست ۱۹۲۴ء
کو لکھا ہے جسمیں ایک روحانی سیادت کی ضرورت پر بڑے شرح و بسط سے بحث
کی ہے اس کے علاوہ ۸ ستمبر ۱۹۲۵ء کو پیرس فرانس سے مولانا برکت اللہ نے
اس سلسلہ میں ایک اعلان بھی شائع کیا اور کرہ ارض کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ
مارچ ۱۹۲۶ء میں قاہرہ میں منعقد ہونیوالی کانفرنس میں ایک روحانی پیشوائے
دین خلیفہ کے انتخاب کرنے کیلئے شرکت کریں۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کو بھوپال کی یاد اور اردو سے پیار

زیورچ میں جب مولانا برکت اللہ بھوپالی کو منشی شاکر حسین نکہت سہوانی کا خط ملا تو مولانا یادِ وطن سے تڑپ اٹھے اور اس کا جواب ۷ ارمئی ۱۹۲۶ء کو جنیوا سے اردو میں ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

عزیزنا الکریم السلام علیکم علی الاصفیا نہ الکرام لا یکم آپ کا محبت نامہ ۴۴ سال کے بعد زودریخ میں ملا چونکہ فارق العادہ واقعہ تھا بیحد و اندازہ خوشی ہوئی۔ اور اس مدت دراز میں ہم کرہ الارض کے پیرامون دوبار گردش کر چکے اور دنیا کے بڑے بڑے لوگ دیکھے مگر بھوپال کے سیدھے سادھے لوگ چھوٹے چھوٹے مکان اور تنگ تنگ گلیاں اب تک محبوب و مرغوب خاطر ہیں یہ نامہ میں جنیوا سے لکھ رہا ہوں اور پرسوں یہاں سے برلن عاصمۃ المدنیا چلا جاؤں گا۔ کتاب خلافت بزبان انگلش اور ایک رسالہ بزبان عربی معہ تحدیر این مخلص خدمت میں ارسال کردوں گا۔ ایک عربی ماہانہ رسالہ اب برلن میں زیر طبع ہے زیادہ خیریت ہے۔ اسلام کتبہ محمد برکت اللہ یہ دستاویزی خط راقم الحروف کے پاس موجود ہے مولانا برکت اللہ بھوپالی کی مکمل سوانح عمری شائع کیا جا رہا ہے۔

سوئٹزرلینڈ سے مولانا برکت اللہ بھوپالی جرمنی چلے گئے۔ اور چند ماہ میں برلن میں پہلی بار تخت علیل ہو گئے راجہ مہندر پرتاپ جب کابل سے برلن پہنچے

مولانا برکت اللہ بھوپالی کی بروسلز کانفرنس میں شرکت

برلن میں مولانا برکت اللہ مرض ذیابطیس میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے علاج کے لئے غدر پارٹی اور دیگر جماعتوں نے چندہ کر کے ایک ہزار ڈالر سان فرانسسکو سے بھیجا ابھی پوری طرح صحتیاب بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ بروسلز بلجیم میں فروری ۱۹۲۷ء سامراج دشمن عالمی کانفرنس کے پہلے اجلاس میں غدر پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی اور یہیں ان کی ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی جو انڈین نیشنل کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کی وفات اور ساتھیوں کے قول و قرار

بروسلز کانفرنس کے بعد مولانا جرمنی واپس آئے تو پھر مرض نے زور پکڑ لیا۔ اس وقت راجہ مہندر پرتاپ بھی مشرقی ممالک کا گشت لگا کر برلن پہونچ گئے اور یہاں سے دونوں حضرات نیویارک روانہ ہو گئے۔ تاکہ وہاں سے غدر پارٹی کے مرکز لیگا نتر یہ آشرم پہونچکر ٹھیک سے علاج کرایا جائے جب نیویارک پہونچے تو رقم ختم ہو چکی تھی تار دینے پر سو ڈالر جواب تک نہیں دیا گیا لیکن ہندوستان نیشنل پارٹی نے مولانا برکت اللہ بھوپالی کا بہت ساتھ دیا۔ چودھری مہندی خاں نے سردار گربال سنگھ کو اخبار ہندوستان کے دفتر میں ٹیلی فون کر کے بتایا کہ مولانا برکت اللہ بھوپالی کئی روز سے نیویارک آئے ہوئے ہیں ان کے پاس کرایہ تک نہیں ہے کہ وہ ہزار میل کا سفر کر کے سان فرانسسکو پہونچ سکیں۔ جلد سے جلد سردار شیر سنگھ سکریٹری نیشنل پارٹی سے ملکر کم از کم تین سو ڈالر بھیجدو چنانچہ روپیہ بھیجدیا گیا اور جب

مولانا سان فرانسسکو پہونچے تو ہندوستان نیشنل پارٹی کے نمائندوں نے بندے
ماترم کے نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ لیکن غدر پارٹی کے پورن سنگھ کا طرزِ عمل ٹھیک
نہیں تھا چودھری خاں ان کی خدمت میں رہنے لگے۔ مولانا برکت اللہ کی حالت
جب زیادہ خراب ہوئی تو ان کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اسوقت ڈاکٹر سید حسین
ایڈیٹری اور نیٹ لاس اینجیری ANGELE میں لیکچرر رہے تھے۔ سردار گوپال
سنگھ نے انہیں تار دیکر بلالیا اب ڈاکٹر سید حسین کی تیاری تھی لیکن وقت سفر آپہونچا اور
مولانا ۲۰ ستمبر ۱۹۲۷ء کی رات کو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

مولانا کی تجہیز و تکفین پر نصف:۔ مصارف غدر پارٹی نے اور نصف مصارف
نیشنل پارٹی نے برداشت کئے آپ کا جنازہ سیکرامینٹو Saatamatma لایا گیا
اور یہاں ایک عالی شان ہال میں رکھا گیا اور ایک بڑا بھاری جلسہ منعقد ہوا سردار
جیت سنگھ داس بہاری بوس دلیپ سنگھ گل سندر ناتھ گھوش پروفیسر دیگر ممالک
سے آئے ہوئے تار پڑھ کر سنائے گئے۔ اور مسلمان ہندو اور سکھوں نے اپنے عقائد
کے اعتبار سے جنازہ کی رسومات ادا کیں۔ اور پھر چہرہ نمائی ختم ہوئی اور کوئی ڈیڑھ
ہزار روپے کی قیمت کے بکس میں بند کر کے میرز ویل لیجایا گیا اور مسلمانوں کی قبرستان
میں یہ کہہ کر دفنایا گیا کہ ہندوستان آزاد ہونے پر تمہاری میت ہندوستان پہونچائی
جائیگی۔ اور یہ وعدہ اجبار پورا نہ ہو سکا۔ دفنانے کی آخری رسوم مولوی رحمت علی
ڈاکٹر سید حسین اور ڈاکٹر اورنگ شاہ نے ادا کی راقم الحروف ہندوستانی قونصل جنرل
مقیم سان فرانسسکو کیلیفورنیا نے تحریر فرمایا ہے کہ ڈاکٹر رونگ شاہ ابھی بقید حیات
ہیں اور کرانٹوں میں مقیم ہیں اور سان فرانسسکو میں وہ مکان جسمیں مولانا برکت اللہ
نے قیام کیا تھا اور اپنی انقلابی سرگرمیوں کا مرکز بنا رکھا مدت ہوئی اپنا وجود
کھو بیٹھا لیکن اس کا کچھ حصہ ہندوستان قونصل خانے کے قبضہ میں ہے اور

ہندوستانی قونسل خانہ اس جگہ غدر پارٹی کے شہداء کی ایک معقول وشاندار یادگار قائم کرنیکی کوشش میں مصروف ہے۔

مجاہدِ اعظم انقلاب مجسم و فکرِ اعظم برکت اللہ بھوپالی کی روح کو ہمارا سلام اہل بھوپال کا سلام آزادئ ہندوستان کا سلام

ایم عرفان بھوپال

ختم شد

علامہ منصور انصاری

ریشمی خطوط کا ہیرو!

ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کی نجات کا علمبردار!

۱۹۱۵ء سے ۱۹۴۶ء تک

آزادی، اور انقلاب۔ کا ایک شعلہ جو تیس سال تک بھڑکتا رہا
جسے ہندوستان کی آزادی کیلئے جزیرۂ عرب قبائل آزاد
افغانستان، روس ترکی اور آذربائیجان کے سنگلاخ پہاڑوں
میں جلاوطنی کے دن گذارے۔ اور ۱۹۴۶ء میں مہتر الملک نغمان
مشرقی افغانستان میں ہمیشہ کی نیند سوگیا۔

یہ تاریخ فروگذاشت ہے یا قدرت کا معاملہ ۔ کتنے جواہر نامعلوم کہاں گمنامی کے پردوں میں چھپ جاتے ہیں، کیسے کیسے انسان خدا کی اس زمین سے اٹھے ابھرے ۔ اپنا فرض ادا کیا اور دنیا سے رخصت ہو گئے ۔ مگر تاریخ کے صفحات ان کے کارناموں سے بار، پا سکے، حالانکہ مورخ ان کے متعلق کچھ لکھنے کا ارادہ کرے تو اسے اپنا قلم سونے کے پانی میں ڈبو نا پڑے ۔ شاید یہ وہ لوگ تھے جو شہرت، ناموری، اور دنیوی نمود و نمائش سے کوسوں دور تھے ۔ ان کے علم و فضل، عظمت کمال اور خدمت و قربانی کا صرف ایک ہی حاصل تھا ــــ اور وہ یہ کہ انکی مخلصانہ خدمات جو خاص اللہ کے لئے تھیں، شہرت کے چوراہے پر آ کر برباد نہ ہوں ۔ یہ ان کا فیصلہ تھا ۔ لیکن تاریخ کا جج زیادہ عرصہ تک ایسے لوگوں سے بے انصافی نہیں کر سکتا ۔ میں نہ کوئی مورخ ۔ نہ کوئی مشہور اہل قلم مگر خدا کا نام لیکر ایک ایسے عظیم و جلیل مجاہد کی زندگی کا جوہر پیش کر رہا ہوں جسکا نام شہرت کی گیلری میں آج تک آویزاں نہیں ہو سکا ۔

مری انتہائے نگارش یہی ہے
ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

وہ عجیب و غریب، دلیر و شجاع انسان جس نے دیوبند سے مدینہ منورہ پشاور، کابل، روس، ترکستان (بخارا)، ماسکو، انقرہ وہاں سے اٹلی، ایران اور وہاں سے آذربائیجان کا سفر کیا ۔ جس کے سارے سفر نہ حصول زر کیلئے تھے نہ تجارتی مقاصد کیلئے نہ شہرت، ناموری کیلئے، نہ سیاحت کے لئے ۔ بلکہ جو ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک مقام سے دوسرے مقام ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک صرف اس لئے گیا کہ اسے اپنے وطن عزیز کو آزاد و خود مختار دیکھنے کا ارمان تھا ۔ وہ فرنگی استبداد کے خلاف جہاں بھی ذرا سی روشنی پاتا اسطرف کا رخ کرتا جس شخص

نے دونوں جنگ عظیم کے انقلابات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ جن سے ملک کی آزادی اور قوم کی نجات کیلئے دنیا سے پہاڑوں میں ٹکریں کھائیں۔ راجہ مہاراجوں کے طواف کئے۔ سیاست اور سماج کے بدلتے رنگ دیکھے۔

اور پھر اسی آزادی اور انقلاب کے راستے میں اپنی جان دیدی۔ اس مجاہد جلیل نے اپنی خدمات کو اپنی ذات کا اشتہار بنانا گوارہ نہ کیا۔ اور مورخ جب مجاہدین آزادی کے دربار سے گذرا تو ایک کرسی خالی دیکھکر بھی اس کا ذوق تجسس خوابیدہ ہی رہا آج میں اس مجاہد کا نام قوم کے سامنے لے رہا ہوں۔۔۔۔

مولانا محمد میاں انصاری

ہندوستان کی جنگ آزادی میں کروڑوں ہندوستانیوں نے حصہ لیا! لاکھوں ہم وطنوں نے قربانیاں دیں۔ ہزاروں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوگئیں سیکڑوں خاندان لٹ گئے۔ مگر اسے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون لوگ تھے! مولانا محمد میاں انصاری ایک مفکر۔ ایک مجاہد۔ ان لوگوں میں سے تھے جن کو نام ونمود سے نفرت تھی۔ اور جو اپنی دھن کے سچے۔ اور کام مخلص تھے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنی سوانح "نقش حیات" کی دوسری جلد میں آپکا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"مولانا منصور صاحب انصاری" ـ اصلی نام محمد میاں تھا۔ موصوف حضرت مولانا محمد میاں قاسم صاحب نانوتوی" بانی دارالعلوم دیوبند کے نواسے اور حضرت شیخ الاسلام مولانا عبداللہ صاحب ناظم دینیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے بڑے صاحبزادے تھے۔۔۔۔ حضرت شیخ الہند نے انکو اپنے مشن کا ہمراز بنایا اور اسکیم میں شریک کرلیا۔

نہایت مستقل مزاج، ذکی الطبع، رازدار اور قابل اعتماد تھے۔ ان کو ذمہ دار بنے

والے خطرات سے دوچار ہونا پڑا مگر یہ ثابت قدم رہے۔ مولانا محمد میاں صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند میں اپنے حقیقی ماموں مولانا حافظ محمد احمد صاحب سے زمانۂ تعلیم میں مشکوٰۃ شریف کے "باب جہاد" کی تعلیم حاصل کی اور خود بھی اسکا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تعلیم اور صحبت سے اس جذبۂ جہاد کو آزادی کا رنگ ورخ دیدیا۔ اور تمام عمر وطن کی آزادی کیلئے لڑتے رہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کا بنیادی مقصد ہندوستان کی آزادی تھا۔ مولانا منصورؒ اس تحریک کے ہیڈ کوارٹر یاغستان میں مولانا عبداللہ سندھیؒ راجہ مہندر پرتاپ اور دیگر حضرات کے ساتھ مصروف کار تھے۔ مولانا منصورؒ کا قول تھا کہ ایشیا، افریقہ کے غلام مملکت کی آزادی کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہندوستان کو آزاد کروایا جائے۔ ان کا قول حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا، اور اس لئے انہوں نے مولانا محمود الحسنؒ کی سیادت میں آزادی کیلئے جدوجہد کی۔ اور اس مقصد کیلئے جہاد کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔ یہ تحریک اگرچہ مسلم اکابر اور علماء کی تحریک تھی لیکن اسمیں ہندو بھی برابر کے شریک تھے۔

رولٹ کمیٹی رپورٹ کے مطابق:۔ مولانا عبداللہ سندھیؒ نے کابل پہنچکر ترک و جرمن مشن سے ملاقات کی اور اپنے مقاصد ان کے سامنے رکھے۔ اسی اثناء میں مولانا محمد میاںؒ صاحب بھی کابل پہونچ گئے۔ مولاناؒ کے اسوقت دستاویز جہاد تھی۔ آپ نے حجاز کے ترک سپہ سالار غالب پاشا سے حاصل کی تھیں۔ یہ دستاویز غالب نامے کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا محمد میاںؒ نے اس دستاویز کی نقلیں ہندوستان اور یوعلاری قبائل میں تقسیم کیں۔

آپ کے کابل پہونچنے پر مولانا عبداللہ سندھی نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آزاد ہندوستان کی ایک جلاوطن حکومت کے قیام کا پلان طے کیا جس کے صدر

راجہ مہندر پرتاپ ۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی وزیر اعظم ۔ مولانا عبید اللہ سندھی وزیر خارجہ تھے ۔ یہ پہلی آزاد حکومت تھی جو ہندوستانیوں نے ہندوستان سے باہر قائم کی تھی ۔ اس حکومت کے تحت ایک فوج کے قیام کا منصوبہ بھی تھا جو پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا ۔

دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اندازہ ہے کہ ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں شیخ الہند اور مولانا منصور میں سیاسی استاد و شاگرد کا رشتہ قائم ہوا ۔ انہوں نے وقت کا اہم ترین کام مولانا کے سپرد کیا ۔

۱۹۱۴ء میں ریشمی خطوط کی تحریک مرتب ہوئی ۔ اور ۱۹۱۵ء میں مولانا محمد میاں اس کے ذمہ دار قرار پائے ۔ اسی سال شیخ الہند نے حج بیت اللہ کا ارادہ فرمایا ۔ لیکن یہ ارادہ صرف حج کا نہیں تھا ۔

حجاز سلطنت ترکی کا ایک حصہ تھا ۔ پہلی جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی ۔ اور ترکی جرمنی حمایت میں تمام مورچوں پر موجود تھے ۔ شیخ الہند کا مقصد تھا کہ وہ ترکی کے ارباب حل و عقد کو ہندوستان کی آزادی کے تمام مسائل سمجھا دیں ۔ تاکہ صلح کی صورت میں ترکی کی جانب سے ہندوستان کی آزادی کی شرط رکھی جا سکے ۔ مولانا محمد میاں اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے ۔ مولانا ممدوح کا بیان ہے کہ اس سفر میں برطانوی جاسوس بھی ہمراہ تھے ۔ مولانا موصوف آگے فرماتے ہیں کہ خدا ان کے گناہوں کو معاف فرمائے ۔ انہوں نے گورنمنٹ کی خدمت کی پوری کوشش کی ۔ لیکن وہ اپنے مقاصد میں قطعی ناکام رہے ۔

تحریک ریشمی خطوط :- ریشمی خطوط کی تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ ایک پلیٹ فارم سے ہو ۔ اس وقت پورے ہندوستان میں مختلف تحریکوں کے تحت آزادی کے

ہند کی کوشش جاری تھی۔ ساتھ ہی اسکا مقصد یہ بھی تھا کہ شمالی مغربی سرحد پر ایک زبردست مسلح بغاوت کے تحت ان تحریکوں کو تقویت بہم پہنچائی جائے۔ اس تحریک کے بنیادی مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی شیخ الہند کے منصوبے کے تحت سرحد آزاد میں پہنچکر سارے سیاسی پلان اپنے ہاتھ میں لیں۔ اور عملی اقدامات کیلئے مولانا محمد میاں اور ان کے ساتھ آنے والے ریشمی خطوط کا انتظار کریں۔ تحریک کو تقویت پہنچانے کیلئے ترکی سے جنگی مدد کی جائے۔"

افغانوں کے جذبۂ حریت پر اعتماد کرتے ہوئے شاہ افغانستان کو انگریزی سامراج کیلئے تیار کیا جائے۔ نیز سلطان ترکی کی جانب سے شاہ افغانستان اور آزاد قبائل کو ریشمی فرامین بھیجے جائیں۔

جب شیخ الہند اور مولانا محمد میاں مدینہ منورہ پہنچے تو ترکی کے وزیر جنگ غازی انور پاشا اور مغربی مورچوں کے کمانڈر غازی جمال پاشا وہاں موجود تھے۔ غالب پاشا گورنر حجاز نے چاروں اکابر کے مشوروں کے بعد ریشمی فرامین شیخ الہند کے سپرد کر دیئے مولانا محمد میاں ان فرامین کو لیکر ہندوستان واپس آئے۔

مہم کی ابتداء

یہاں سی۔ آئی۔ ڈی آپ کی تلاش میں تھی اور کئی بار دھوکہ دیکر آپ امی سرزادگان بڑوت اور میرٹھ ہوتے ہوئے لاہور پہونچ گئے۔ اس بیان کے مطابق مولانا آزاد اور مولانا حسرت موہانی بھی لاہور میں آپ سے ملنے والے تھے اور اس کے بعد یہ تین آدمیوں کا قافلہ افغانستان کی جانب بڑھنے والا تھا لیکن سی۔ آئی۔ ڈی کی کڑی نگرانی اور نگہداشت کی بنا پر مولانا محمد میاں صاحب کو قبل از وقت پشاور پہنچنا پڑا۔ پشاور میں مولانا عبدالرحیم پوپل زئی کے

مکان میں ایک نیچے کی کھلی دیوار میں تین دن کی روپوشی کے بعد آپ نے ایک شب کے اندھیروں میں پشاور کو بھی خیرباد کہدیا۔ جس وقت آپ نے ایک افغان قبائلی کے بھیس میں مکان چھوڑا۔ پولیس اور سی۔آئی۔ڈی اس مکان کا محاصرہ کئے ہوئے تھی۔ تمام راستے آپ گونگے بنے رہے۔ اور اشاروں سے گفتگو کرتے تھے لوگوں کے پوچھنے پر آپ اشاروں ہی سے بتایا کرتے تھے کہ کسی مشہور درگاہ کی زیارت کیلئے جا رہے ہیں۔ مجاہد پوپل زئی کے آدمی تمام رات آپ کے ساتھ رہے اور نقل و حرکت میں خفیہ طور پر معاونت کرتے رہے۔

قبائل میں پہونچ کر مولانا محمد نے فرامین تقسیم کئے۔ اور چالیس ہزار کی ایک فوج تیار کی جو وزیری اور مہمند قبائل افغانوں پر مشتمل تھی۔ اسی دوران آپنے مجاہدین چمبر کنڈ مجاہدین نیز فرور حاجی صاحب فرنگ زئی سے بھی تعلقات قائم کئے اس خفیہ تحریک کا مرکز جیدولی کی پاڑی گھاٹیاں تھیں۔

قبائل میں اپنا کام مکمل کرنے کے بعد آپ افغانستان پہونچے۔ یہاں بنیادی کام مولانا عبیداللہ سندھی انجام دے چکے تھے۔ مولانا محمد میاں نے ریشمی فرامین شاہ حبیب اللہ کو پہونچائے۔ یہاں آپ کی ملاقات امیر امان اللہ خاں سے بھی ہوئی۔ سردار نصراللہ امیر حبیب اللہ کے چھوٹے بھائی نے اس تحریک میں زبردست دلچسپی لی۔ مولانا محمد میاں صاحب نے افغانستان کے مدبرین اور نوجوان طلبائے طبقوں کو بھی اپنے نظریات سے بے حد متاثر کیا۔ لیکن اب بھی آپ افغانستان میں اپنے کام کو پوری طرح انجام نہیں دے پائے تھے کہ انگریزوں کے اکسانے پر امیر حبیب اللہ نے آپ کو گرفتار کرنیکی ٹھان لی۔ سردار نصراللہ کی بروقت مدد سے آپ روس (بخارا) پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ کریمیا کے علاقہ میں ترک قوم کی آزادی کے لئے اپنی زندگی کی آخری جنگ میں مصروف تھے، وہ مولانا

موصوف سے ملاقات کی خواہش مند تھے۔ لیکن جب مولانا وہاں پہونچے تو یہ ترکی شیر جامِ شہادت نوش کر چکا تھا۔ مولانا موصوف نے بخارہ کی قدیم اسلامی حکومت کا مطالعہ کیا اور اس کی کمی کو نہایت شدت سے محسوس کیا کہ باوجود عملی سربلندی کے بخارا میں نئے سائنسی آلات کا مقابلہ کرنے کی مقاومت نہ تھی۔ آپ کی بڑی آرزو رہی کہ مسلمان سائنس کو سمجھیں اور بڑے سائنداں پیدا کریں۔

شخصیت کے دیگر رخ ۔ نوجوان انقلابی افغانوں نے امیر حبیب اللہ کو قتل کر کے امیر امان اللہ خاں کی قیادت میں نئی حکومت قائم کی۔ اور اسی نئی حکومت کی درخواست پر آپ دوبارہ کابل تشریف لائے۔ کچھ ہی عرصہ بعد آپ حکومت ترکی افغان کی آزادی کا اعلان کروانے کیلئے ایک خفیہ سفارت پر انقرہ روانہ ہوئے لیکن راستے میں روسیوں نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ تین ماہ کی قید کے دوران حکومت روس کی طرف سے تین بار آپ کی موت کا فرمان جاری ہوا لیکن افغان روس کے سفارتی تعلقات کے قیام کے بعد آپ رہا ہو گئے۔ اور ماسکو میں افغانی سفارت کے ایک رکن کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بمشکل ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں آپ افغانستان کی ترکی سفارت میں سیاسی مشیر کے طور پر پہونچ گئے سفیر کی غیر موجودگی میں اس کے قائم مقام آپ ہی رہا کرتے تھے۔ یہاں پر آپ نے خفیہ کونسل کی بنیاد ڈالی۔ جو غلام قوموں کی آزادی کے سلسلہ میں مشورے کرتی تھی۔

کاظم قرہ بقر شیخ سنوسی اعظم (طرابلس کے انقلابی قائد) محمد سعید (کردو قائد) عبدالعزیز چاویش (مصری قائد) کرنل مظفر (باغی ہندوستانی فوجی) مولانا عبدالمنان امرتسر کے ایک مجاہد) اور نگینہ ضلع بجنور کے مولا بخش (ترکی توپ خانے کے انچارج) اور دوسرے بڑے قائدین اس کونسل میں شامل تھے۔

آپ ترکی میں بھی زیادہ عرصہ نہیں رہے۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا سے مسئلہ خلافت پر اختلاف کے سبب واپس افغانستان بلا لئے گئے۔ اور افغان وزارت خارجہ کے مغربی ایشیائی شعبے میں تشریف لے آئے۔ آپ کے سیاسی شاگرد سردار فیض محمد خاں (وزیر خارجہ) کی درخواست پر آپکا تقرر ڈائریکٹر آف ایجوکیشن (وزارت تعلیمات) کے عہدے پر ہوا۔

آپ کے علمی کارناموں میں مندرجہ ذیل کتب شامل ہیں۔

- علامہ شبلی کی شعر العجم کا فارسی ترجمہ۔
- حکومت الٰہی (پولیٹیکل سائنس)
- مراقبۂ نماز
- انواع الدول (پولیٹیکل سائنس)

مولانا محترم کو ہندوستان واپس آنے کی بڑی خواہش تھی۔ خود آپکے ہندوستانی اقرباءبھی آپ کیلئے بےچین تھے۔ لیکن زندگی نے آگے یاوری نہیں کی۔ جنگ آزادی کا پرجوش مجاہد۔ ہندوستان کا شیر۔ ملک آزاد دیکھنے کا خواہشمند اور قوم کو ترقی اور آزادی کا زینہ دکھلانے والا یہ عظیم شخص۔۔۔ ۱۲ جنوری ۱۹۴۲ء کو اسلام اور وطن کی راہ میں شہید ہوگیا۔
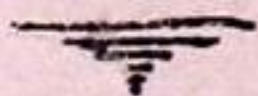
مولانا فضل الٰہی

وزیر آبادی

کئی ماہ ہوئے ہیں وزیر آباد میں مولانا فضل الٰہی کی خدمت میں دو دن رہا اس وقت سے ہی یہ خطرہ شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ بڑھاپا اور یہ انتہائی کمزوری اور اس پر ہڈیوں کا ڈھانچہ بیماری کے اس شدید حملے کا کب تک مقابلہ کر سکے گا۔ آخر ۵ رمئی کو سخت بے بسی اور بے کسی سے مولانا فضل الٰہی صاحب انتقال فرما گئے۔ میں ۶ رمئی کو دفتر احرار لاہور آیا۔ تو یہ خبر وحشت اثر معلوم ہوئی۔ مجھے سخت صدمہ اور افسوس ہوا۔ دفتر میں ماسٹر تاج الدین انصاری تشریف فرما تھے۔ ان سے دیر تک مولانا کی پچاس سالہ تحریک مجاہدین میں جدوجہد۔ ان کی تکلیفوں مصیبتوں اور اذیتوں کا ذکر اور بے حس قوم کا جو محلوں میں رہنے والوں پر پھول برساتی جھوم جھوم کر نعرے لگاتی۔ اور سچے جذبے کے ساتھ کام کرنیوالوں سے ایسی بے اعتنائی برتتی ہے جیسی مولانا فضل الٰہی سے برتی گئی ہے۔ دیر تک تذکرہ ہوتا رہا۔

محترم ماسٹر صاحب نے بار بار مجھ سے ارشاد فرمایا کہ میں تو چونکہ ۱۹۱۷ء سے ان کے ساتھ وابستہ اور ان کی جدوجہد میں شریک رہا ہوں۔ اس لئے مجھے ان کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالنی چاہیئے۔

میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں ان تکلیفوں اور ان اذیتوں کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔ جفاکش اور باہمت نوجوان پہلے ہی نہیں مل سکتے۔ مصیبتوں کے لامتناہی سلسلہ اور اس کا انجام دیکھکر مسلمان اور بھی حوصلہ ہار دیگا۔ راہ حق پر گامزن ہونے اور خدمت قوم کے لئے صحیح قدم اٹھانے کا کوئی ارادہ بھی کرے تو ہمارا حال پریشاں دیکھ کر اور ان ہولناک باتوں اور اس کا حسرت ناک انجام سن کر اس کا دل اور بھی بیٹھ جائیگا۔ جسے اس راہ پر چلنا ہے وہ بھی مڑ جائیگا۔ ۱۹۱۷ء سے تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ ہم میں کتنے لوگ آئے۔ اور وہ کتنا عرصہ رہے۔ پھر مصیبتوں سے گھبرا گھبرا کر کس طرح رخصت ہوتے گئے۔

۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹیوں میں آنیوالے بے شمار تھے۔ وہ ایک ابال تھا۔ اور مسلمان ابال اور ہنگامہ سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے۔ جس تیزی سے وہ آتا ہے۔ ابال کی مہلت ختم ہونے پر وہ اسی تیزی سے دوڑ جاتا ہے۔ خلافت کی تحریک میں جو بے شمار آدمی آئے۔ ان میں کتنے آخر دم تک راہ حق پر گامزن رہے۔ آج ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اور اس راستے سے منہ موڑنے والوں کی گنتی کون کر سکتا ہے۔ آج میں ان مشکلات ان مصائب اور دشواریوں کا ذکر کروں جن سے مولانا فضل الٰہی اور ان کے ساتھیوں کو سال ہا سال سے دوچار ہونا پڑا تو ممکن ہے۔ کہ آنسوؤں اور آہوں کا تحفہ آپ فیاضی سے دیدیں۔ لیکن اس راہ پر چلنے کی خواہشمندوں کی تعداد ابھی کم ہو جائیگی پھر ستایا کسے جائے۔ انہیں خشکی زبانوں سے ہمارے لئے بڑی بے تکلفی سے غداری کا لفظ نکلتا ہے۔

ہم نے انگریز کے ساتھ ۱۹۴۶ء تک جنگ کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاید انگریز کے رشتہ دار ہیں۔ اس سلسلہ کے شروع کرنے سے شاید میرے احباب دوستوں اور رفیقوں کی معلومات میں کچھ اضافہ ہو سکے۔ اور تو اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ کیونکہ ؎

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

ہاں اگر کوئی صاحب مجاہدین کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں۔ تو میں ان کو ۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۵ء تک کے حالات و سکنات سے واقف اور ان کی سرگرمیوں میں شریک رہا ہوں۔ ۱۹۱۷ء کے آخر یا ۱۹۱۸ء کے شروع میں مولانا مرحوم میرے پاس تکیہ موری دروازہ لاہور کوچہ سرکی بندان کے ایک مکان میں جہاں ہمارا قیام تھا۔ تشریف لاتے۔ اس دن سے لیکر آخر دم تک میں ان کے کاموں میں شریک اور

ان کی تحریک کا مددگار رہا۔ حضرت مولانا کا میرے پاس تشریف لانے کا قصہ
یوں ہے۔

[illegible]ء میں میں پہلے اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ اور پھر کچھ عرصہ کے
بعد مسلم ہائی اسکول میکلوڈ روڈ لاہور میں پڑھتا تھا۔ بصرہ، بغداد، حجاز اور مکہ
شریف کی تباہی اور ترکوں کی بربادی کی خبروں کو سن سنکر انگریز کے سخت خلاف
ہو چکا تھا۔ میں گھنٹوں سوچا کرتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے مسلمان لپک لپک کر انگریزی
فوج میں بھرتی ہو رہے ہیں آخر میں نے اپنے دل میں بغاوت کا فیصلہ کر لیا۔ خواہ
میرا کوئی ساتھ دے یا نہ دے۔

سب سے پہلے میں نے اپنے چچازاد بھائی سردار محمد (سردار محمد حسین ایم۔ ایل
اے۔ کے بڑے بھائی) کو جو مجھ سے تین سال عمر میں بڑے اور   میں تھے شریک
ہونیکا مشورہ دیا۔ ہم ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ میں اسوقت آٹھویں
جماعت میں تھا۔

ہمارے بزرگ خان بہادر آنریری مجسٹریٹ اور کئی بزرگ ذیلدار تھے
ان کے اسلحہ سے جب ہم گاؤں میں جاتے تو بندوق اور پستول چلانا اور نشانہ لگانا
سیکھتے۔ ہم دونوں بیاہ شادی کے موقعہ پر جب برادری کا اجتماع ہوتا اور ہم شریک
ہوتے تو وہاں انگریز کے خلاف دل کھول کر تبلیغ کرتے۔

لاہور میں ہم اپنے سکول میں جاکر طلباء کو بغاوت کیلئے ابھارتے کچھ طلباء
نے ہمارے ساتھ حلف اٹھائے۔ سردار عطاء محمد بیمار ہوا اور وہ گاؤں چلا گیا۔ اسی
مکان پر ایک روز مولانا فضل الٰہی صاحب کسی ذریعہ سے تشریف لائے۔ دوران
گفتگو میں انہوں نے فرمایا کہ جس دن چھٹی ہو میرے پاس وزیرآباد فلاں محلہ میں
آنا۔ میرا نام فضل الٰہی ہے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ کسی سے میری ملاقات کا ذکر

وزیر آباد آنیکا ہرگز ذکر نہ کرنا۔

میں نے عرض کیا کہ آپ کو میری انگریزی دشمنی کا حال کس نے بتایا۔ انہوں نے فرمایا کہ کچھ تو تمہاری برادری کے لوگوں نے اور کچھ طلباء نے۔ میں جمعہ کی چھٹی میں وزیر آباد گیا۔ سارا دن مولانا کی خدمت میں رہا۔ کچھ چند کتابیں دی۔ جن میں سید احمدؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ کی سوانح عمریاں تھیں۔ انہوں نے مجھے ہدایت فرمائی کہ سکول کی چھٹی میں تم یہاں آیا کرو جب۔ مجھے وہاں کئی ماہ آتے جاتے گذر گئے۔ تو ایک دن انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان سے باغستان میں پیغام لیجانے والے سبھی قاصد پکڑے گئے ہیں۔ انگریز نے ان کو عمر قید کی سزا دی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ قاصد کے فرائض میں ادا کرنیکو تیار ہوں۔ آپ مجھے وہاں روانہ کریں۔ وہ بولے مجھے خطرہ ہے کہ تم شاید سختی برداشت نہ کر سکو اور تمام باتیں بتا نہ دو۔ کیونکہ تم امیر خاندان سے ہو۔ اور تم نے ابھی تک کوئی سختی برداشت نہیں کی ہے۔

میں نے ان یقین دلایا۔ کہ میں یہ کام اچھی طرح کرونگا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر فرمایا۔ اچھا میں تمہارا اعتبار کرتا ہوں۔ خدا تمہیں ثابت قدم رکھے۔ اب تم ایک ہفتہ کی چھٹی کا انتظام کر لو۔ مجھے ایک ہفتہ پہلے اطلاع دینا اور چھٹی ہونے سے ایک رات پہلے یہاں آجانا۔ چنانچہ اگلی ملاقات میں میں نے انہیں تاریخ سے مطلع کر دیا۔ میں مقررہ تاریخ پر ان کے مکان پر پہنچا۔ مولانا نے وہاں ایک آدمی سے میرا تعارف کرایا۔ اور بتایا کہ باغستان کے تمام راستوں سے واقف ہے۔

غرضکہ ہم روانہ ہوئے اور سی آئی۔ ڈی کی نظروں سے بچتے بچاتے ہم خیریت دربند پہونچ گئے۔ وہاں سے کشتی کے ذریعہ دریا پار کیا۔ اور آزاد علاقہ میں پہونچ گئے۔ پیدل سفر کرتے ہوئے بمشکل ہم شام کے قریب المس دیو مجاہدین

کا ہیڈ کوارٹر تھا) پہونچے۔ وہاں جاتے ہی امیر جماعت مجاہدین نعمت اللہ صاحب کی خدمت میں بیٹھ کر ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور ایسی بے ہوشی سے سویا کہ صبح ہی آنکھ کھلی۔

میں نے امیر المجاہدین کی خدمت میں صبح کپڑے پر لکھے ہوئے خطوط جو میری قمیص کے کفوں اور پشت کی پٹی کے اندر اور کوٹ کے کالر میں سلے ہوئے تھے۔ اسے ادھیڑ کر نکالے اور پیش کر دیئے۔ دوسرے دن میں نے وہ سب باتیں جو مولانا نے زبانی بتائی تھیں۔ امیر جماعت سے عرض کر دیں۔ یہ تو مجھے علم نہیں کہ ان خطوط میں کیا لکھا ہوا تھا۔ زبانی باتوں میں ایک ایسی تھی جس کا ذکر میں نے اس طرح کر دیا جس طرح مجھے بتایا گیا تھا۔ اس کے نتیجہ سے میں بے خبر تھا کتنی ما بعد مجھے اس کی حقیقت اور اصلیت معلوم ہوئی۔ تو میں مولانا کی قوت اور تدبیر پر حیران رہ گیا۔ زبانی پیغام تو صرف یہ تھا۔ کہ :۔

۱:۔ ہم نے خاص ذرائع سے جنگ کے شروع انگریز کی ہندوستان میں قوت معلوم کی۔ اور امیر حبیب اللہ خاں والیٔ افغانستان کو اطلاع دی کہ اس وقت سارے ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ دو ہزار گورا فوج ہے۔ ہندوستان پر اسوقت حملہ کرنے سے بہتر وقت پھر کبھی نہیں آئیگا۔ ساتھ ہی امیر حبیب اللہ خاں کو یقین دلایا۔ کہ صرف باغستان سے ہم کو کم از کم ایک لاکھ مسلح بڑے بہادر اور جنگجو آدمی تمہاری امداد پر ہندوستان پر حملہ کرنے کیلئے دینے کو تیار رہیں۔ امیر حبیب اللہ اس پر بھی خاموش رہا۔

۲:۔ جرمن اور ترک جرنیلوں کا جو وفد امیر حبیب اللہ خاں کے پاس آیا۔ اور اس نے بہت بڑی امداد کا یقین دلایا۔ امیر نے وفد کی باتوں کو ٹھکرا دیا۔ جو لوگ اس وفد کو کامیاب کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ وہ عتاب میں آئے۔ امیر حبیب

اللہ ان کو انگریزوں کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اگر چھوٹا شہزادہ امان اللہ ان کی مدد نہ کرتا۔ اور خاص ذرائع سے باغستان نہ بھیجدیتا تو وہ گرفتار ہو کر انگریزوں کے حوالے کر دیئے جاتے۔

۳:۔ صرف امان اللہ ہی ایک ایسا شہزادہ تھا۔ جو انگریز کا خاص طور پر دشمن اور مجاہدین کی امداد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا۔

۴:۔ امان اللہ خاں اور اس کی کوٹھی میں مقیم مجاہدین اور اینٹی انگریز گروپ نے ترک اور جرمن جرنیلوں کو کابل میں ناکامی کے بعد باغستان میں جانے اور مجاہدین کی معرفت تمام قبائل کے غائبگان سے معاہدہ کرنیکا مشورہ دیا۔ وہ وفد باغستان آیا۔ مجاہدین اور قبائل سرداروں سے ایک معاہدہ ہوا کہ تم سب ملکر انگریزی قلعہ پر حملہ کر دو۔ جرمن وفد نے بیس لاکھ پونڈ اور بہت سا سامان حرب دینے کا معاہدہ کیا۔ اس قرار داد کے مطابق مجاہدین کی زیر قیادت سارے باغستان نے مل کر انگریزی علاقہ پر حملہ کر دیا۔ جرمن اور ترک بدیہ اور سامان باغستان میں محض حبیب اللہ کی بدولت نہ پہونچ سکا۔ لہٰذا امیر حبیب اللہ کا راج انگریز کا راج اور حبیب اللہ کی مخالفت انگریز کی مخالفت ہے۔ بہر ممکن طریقے سے امیر حبیب اللہ کو مٹا کر امان اللہ خاں کو امیر بنایا جائے۔ اور اس معاملہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ اگر اس میں ذرا بھی غفلت کی گئی۔ تو مجاہدین چکی کے دو پاٹوں میں ہیں (ادھر انگریز ہے اور ادھر انگریز نواز حبیب اللہ۔) پس جائیں گے۔

میں یہ پیغام دینے کے بعد دو تین روز وہاں رہا۔ امیر المجاہدین نے اسی طرح میرے کپڑوں کے اندر خطوط سلوا کر دیئے۔ اس سفیر کے ہمراہ مجھے واپس روانہ کیا گیا۔ جو مجھے ہری پور ہزارہ تک چھوڑ گیا۔ اور میں وہاں سے وزیر آباد بخیریت

پہونچ گیا۔ مولانا نے مجھے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد مجھ سے حالات دریافت کئے۔ میں نے خطوط نکال کر مولانا کو دیئے۔ میں تمام دن مولانا کے مکان پر رہا۔ اور حالات بتاتا رہا۔ پھر رات کی گاڑی سے لاہور پہونچ گیا۔

حسب معمول میں ہر آٹھویں دسویں دن وزیر آباد مولانا کی خدمت میں جاتا رہا۔ مولانا مجھ سے پارٹی کا کوئی راز نہ چھپاتے کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں وزیر آباد آیا مولانا مکان پر موجود نہ ہوتے۔ دروازہ پر دستک کی آواز ہی سے والدہ صاحبہ (مولانا کی بیوی) پہچان لیتیں کہ محمد شفیع آیا ہے۔ میں گھر کا ایک ایسا فرد تھا۔ جیسے کہ ان کے صاحبزادے محمد سلیمان!

کافی عرصہ کے بعد اخبارات میں خبر آئی کہ امیر حبیب اللہ خاں کے چھوٹے بھائی نصیر اللہ خان کی جلال آباد میں تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی ہے۔ اور بڑا شہزادہ عنایت اللہ خاں نے اپنے چچا نصر اللہ خاں کے حق میں دستبرداری دیدی۔ پھر اطلاع آئی کہ کابل میں امان اللہ خاں نے جوان دنوں وہاں گورنر تھا اپنے بادشاہ ہونیکا اعلان کر دیا۔ یہ خبریں اخبارات میں کئی دن پڑھتا رہا مجھے معلوم تھا کہ مولانا وزیر آباد نہ جا سکے۔

لیکن جب میں نے ساری اسکیم کی کڑیاں ملائیں تو حیران رہ گیا کہ مولانا وزیر آباد میں بیٹھے ہوئے کسطرح اپنی تجاویز انگریز کے مقابلہ میں کس خوبی سے چلاتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ امیر امان اللہ کو تخت نشین کرانے میں مولانا کا زبردست ہاتھ ہے۔

کچھ عرصہ بعد میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور دو تین روز وہاں رہا مولانا بہت خوش تھے۔ اور انہوں نے افغانستان اور اپنی تحریک کے متعلق بہت سی راز کی باتیں بتائیں۔

مولانا فضل الٰہی اور باغستان کے مجاہدین امیر حبیب اللہ سے سخت ناراض تھے وہ سمجھتے تھے کہ پہلی جنگ عظیم میں انگریز کی کامیابی حبیب اللہ کی بدولت ہوئی ہے۔ اگر امیر انگریز کا اسقدر حمائتی نہ ہوتا تو ہندوستان اور مشرق میں انگریز کا نام ونشان مٹ جاتا۔

امیر حبیب اللہ سے اختلاف کی مختصر روئداد یہ ہے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی ابتدا میں حلیف جرمنی کامیاب ہو رہا تھا یورپ میں فرانسیسی اور انگریز بہت بری طرح پٹ رہے تھے۔ جرمن اپنی میں نصیب کرکے جنوب مشرق ساحل اور لندن پر سخت گولہ باری کرنیکا پروگرام بنا چکا تھا۔ لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے اعلان کردیا تھا کہ وہ لندن کی حفاظت نہیں کر سکتا ایسے وقت میں انگریز ہندوستان سے اپنی ساری طاقت لیجا کر جرمنی کا مقابلہ کرنے کیلئے مجبور تھا۔ ہندوستان کی تمام تربیت یافتہ فوجیں جنگ میں جھونک دی گئی تھیں۔ یہاں صرف نئے رنگروٹ اور تھوڑے سے گورے رہ گئے تھے۔

مولانا کو خاص ذریعہ سے اُن دنوں یہ معلوم ہوا کہ یہاں صرف دو ہزار گورا فوج موجود ہے۔ گورا فوج کی تعداد سامان حرب کی کمی اور اس قسم کی ضروری معلومات کرنل ملک عمر حیات ٹوانہ خضر حیات ٹوانہ کے والد سے معلوم ہوتیں وہ ان دنوں انگریزوں میں بڑے مقبول اور ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ خیر خواہ سمجھے جاتے تھے۔

مولانا نے ان خوشگوار حالات کی اطلاع امیر حبیب اللہ کو دیکر ہندوستان پر حملہ کرنیکی ترغیب دی۔ مگر وہ انگریز پرست بادشاہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

جرمن اور ترک جرنیلوں کی کوشش کے باوجود امیر حبیب اللہ ہندوستان پر حملہ کرنیکے لئے تیار نہ ہوا صفحات میں بیان ہو چکی ہے۔

باغستان اور افغانستان میں سمجھ دار طبقہ ان باتوں کو دیکھ کر امیر حبیب اللہ سے سخت ناراض ہوگیا۔ مجاہدین اور مخالف انگریز افغانوں کے دلوں میں ایک آگ سلگ رہی تھی جس کا امیر حبیب اللہ کو کچھ علم نہ تھا کہ وہ اس آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھا ہوا انگریز کی وفاداری کا راگ الاپ رہا ہے جس پہاڑ کے اندر خوفناک شعلے بھڑک اٹھنے کیلئے صرف ایک چنگاری کی ضرورت ہے۔ سردار نصراللہ خاں برادر حبیب اللہ خاں اور سردار عنایت اللہ خاں ولی عہد افغانستان کسی تحریک میں حصہ نہ لینے والے خاموش اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ چھوٹا شہزادہ امان اللہ خاں ابتدا ہی سے انگریز کے مخالفوں کا مددگار اور مجاہدین کا خصوصیت سے بڑا ہی مداح تھا اسی لئے سب کی نگاہیں امان اللہ خاں پر تھیں۔

جوں جوں جنگ عظیم کا خاتمہ قریب آتا جا رہا تھا۔ عوام اور خواص حالات سے آگاہ ہو کر امیر حبیب اللہ کے مخالف ہو رہے تھے۔ اندر ہی اندر ایک تحریک چل رہی تھی مولانا جب جیل سے رہا ہوئے تو انہوں نے شدت سے محسوس کیا کہ کامیابی کے قریب پہونچی ہوئی تحریک صرف حبیب اللہ خاں کی بدولت فیل ہو گئی ہے۔ ان کے دل میں بھی ایک آگ لگی ہوئی تھی اسی لئے وہ بار بار جماعت مجاہدین میں یہی پیغام بھیجتے کہ جس طرح ہو سکے افغانستان میں انقلاب کیا جائے۔

شروع ۱۹۱۹ء میں مخالفین انگریز نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق امیر حبیب اللہ کو اسوقت جلال آباد میں قتل کیا جب اس کو جلال آباد میں آئے ہوئے تین ماہ سے کچھ زائد عرصہ ہو چکا تھا۔

حکومت کابل کے دستور کے مطابق سردیوں کے چھ ماہ امیر حبیب اللہ جلال آباد میں گذارتا۔ یہاں بہ نسبت کابل کے سردی بہت کم ہوتی ہے۔ اور کابل میں بادشاہ کی چھ ماہ غیر حاضری میں حکومت اس طرح ہوتی تھی کہ پہلے تین ماہ ولی عہد

سردار عنایت اللہ خاں بگورنر بنتا ولی عہد سردار عنایت اللہ خاں اپنے باپ
امیر حبیب اللہ کے پاس آچکا تھا۔ اور کابل کا چارج بحیثیت گورنر امان اللہ خاں
کے ہاتھ میں تھا۔ اسوقت امیر حبیب اللہ خاں جلال آباد میں قتل ہوجاتا ہے۔
یہ بات ہرگز نہیں کہی جاسکتی کہ اس قتل میں امان اللہ خاں کا ہاتھ تھا۔ بلکہ اصل
بات یہ ہے کہ مخالفین انگریز کی پارٹی بڑی مضبوط تھی انہوں نے اپنے طور پر سکیم
بنائی اور امان اللہ خاں کیلئے راستہ صاف کیا۔

شروع جنگ عظیم میں ہندوستان سے انگریز کو نکالنے کے سلسلے میں جماعت
مجاہدین اور مولانا کی تجویزوں کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے۔

ماہ اگست میں انگریزوں نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ ان
دنوں جماعت مجاہدین باغستان کے امیر مولانا حافظ عبدالکریم ابن مولانا
ولایت علی صاحب تھے۔ انہوں نے فوراً ایک وفد مولوی عبدالکریم صاحب
قنوجی کی سرپرستی میں دربارہ کابل میں روانہ کیا۔ مولانا عبدالکریم صاحب مشہور
انقلابی لیڈر مولانا برکت اللہ صاحب کے رفیق اور ہم جماعت تھے یہ دونوں
عربی ادب میں نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال کے شاگرد تھے۔ اس وفد کا
مقصد یہ تھا کہ نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں اور قاضی القضاۃ کابل حاجی
عبدالرزاق کے ذریعہ امیر حبیب اللہ خاں کی خدمت میں پہنچ کر یہ یقین دلایا
جائے کہ اگر وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کرے تو تمام باغستان کے جنگجو
بڑی وفاداری کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں امیر کابل کے جھنڈے کے نیچے
جمع ہوجائیں گے۔

امیر حبیب اللہ مجاہدین کے وفد کی معروضات پر کوئی توجہ دی۔ ابھی
یہ وفد کابل میں ہی مقیم تھا کہ ۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو دنیا کے کانوں میں یہ آواز پہنچی کہ

برطانیہ نے خلیفہ المسلمین سلطان ترکی نے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے ۔ اور اس بحیرہ قلزم کے فوجی استحکامات پر قبضہ کر لیا ہے ۔ اس کے فوراً بعد خلیفۃ المسلمین نے عالم اسلام سے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنیکی اپیل کی ہے ۔ اب حنفی فقہ کے رو سے افغانستان کے بادشاہ اس کی رعیت قبائل سرحد اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دعوت کی قبولیت اور جہاد کی شرکت کے لئے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں ۔ مولانا عبد الکریم

مولانا عبد الکریم

امیر وفد مجاہدین نے اس نئی صورت حال کو دیکھ کر کابل کے قاضی القضاۃ حاجی عبد الرزاق صاحب جو مدرسہ دیوبند کے فارغ التحصیل اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ارادتمندوں میں سے تھے ان سے مشورہ کیا ۔ اور یہ طے پایا کہ مولانا شیخ الہند کو جس طرح بن پڑے کابل میں بلایا جائے ۔ اگر وہ تشریف لے آئیں تو شاہ کابل کو بھی چون وچرا کی مجال نہیں ہوگی ۔ تمام افغانستان اور باغستان دیوبند کے شاگردوں سے پٹا پڑا ہے ان کے تشریف لانے اور اعلان جہاد کرنے سے لاکھوں کی تعداد میں مسلح جنگجو جمع ہو جائیں گے ۔ بادشاہ بھی بے بس ہو کر شریک ہونے پر مجبور ہو جائیگا ۔ اور ایسا جوش پھیلے گا کہ افغانستان اور باغستان نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا ۔ کوئی افغان نوجوان کوہ سیاہ سے لیکر ترکستان تک اپنے گھر میں بیٹھا نہ رہ سکے گا ۔

چنانچہ مجاہدین کے چند سرکردہ آدمی شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو اپنے ہمراہ آزاد سرحد میں آنیکی دعوت دی ۔ حضرت شیخ الہند نے مولانا عبید اللہ سندھی اور دیگر ارکین کیا سے مشورہ کرنے کے

دعوت کو قبولیت کا شرف دیدیا

مولانا سندھی ان کو مجاہدانہ کا مشورہ دے رہے تھے ۔ حضرت شیخ

حجاز جانے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ مجاہدین کے وفد نے باغستان اور افغانستان کے حالات سنائے۔ اور یہ عرض کیا کہ لاکھوں جنگجو وہاں آپ کے منتظر ہیں۔ حضور حجاز جانیکی غلطی نہ فرمیں۔ حجاز میں تو صرف تنہائی میں بیٹھ کر ترکوں کے حق میں فتح و نصرت کی دعار کے علاوہ اور کوئی مفید خدمت انجام نہ دے سکیں گے۔

ان دنوں مولانا سندھی ان پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی کسی نامکمل اصول تجویز کے ماتحت حضرت شیخ الہند کو حجاز جانیکا مشورہ دے رہے تھے۔ اور خود باغستان جانیکی تیاری کر رہے تھے۔ حالانکہ مولانا عبداللہ باغستان یا افغانستان میں کوئی مفید کام نہیں کر سکتے تھے۔ شیخ الہند کی وہاں پوزیشن بالکل اور تھی۔ تمام علماء باغستان افغانستان اور ترکستان ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ خود سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت اور قاضی القضاۃ مولانا عبدالرزاق شیخ الہند کے حلقہ بگوشوں میں سے تھے۔

حضرت شیخ نے وفد کی تجویز نہ مانی۔ یہ تجویز اسقدر اہم تھی کہ صرف ایک بات پر تمام دنیا کا نقشہ بدلنے کی پوری امید تھی۔ اس لئے جماعت المجاہدین نے دوبارہ وفد بھیجا۔ جسمیں حافظ شریف اللہ صاحب نیپالی بھی تھے۔ جو مجاہدین باغستان کے ممتاز اراکین میں سے تھے۔ مگر اب کی مرتبہ بھی ناکامی ہوئی۔ اور شیخ حجاز جانے پر مصر رہے۔ حضرت شیخ کی مجلس شوریٰ کے بعض اراکین نے افغانستان جانیکی تائید نہ فرمائی۔ وہ بھی محض سرزمین حجاز کی عقیدت کی بناء پر حضرت شیخ کو حجاز جانیکی ترغیب دیتے۔ آخری مرتبہ بھی پیغام مولانا فضل الٰہی نے (جو ان دنوں امیر مجاہدین ہند تھے) حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ یا حضرت لاکھوں

جنگ جو حضور کے منتظر ہیں ۔ آپ کے باغستان تشریف لے جائیں ہے ۔
دنیا میں ایک عجیب انقلاب آجائیگا ۔ صدیوں کے خواب پورے ہوجائیں گے
نہ صرف ہندوستان میں انگریزی سلطنت بلکہ مشرق بعید میں بھی یورپ کی
طاقت تنکے کی طرح بہہ جائیگی ۔ لیکن شیخ الہند حجاز جانے پر جمے رہے ۔

(سردار محمد شفیع)

دار العلوم دیوبند

مجاہدۂ حریت کی ایک عظیم الشان تاریخ

ہندی مسلمانوں کے متعلق آج سمجھا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے صرف پاکستان بنوایا۔ اور ہندوستان کی آزادی کیلئے ان کی مساعی کا حاصل صفر ہے۔ حالانکہ مسلمانوں نے ذہنی و فکری طور پر آزادی وطن کو اپنا مذہب سمجھا! انہوں نے مذہبی تعلیمی ادارے قائم کئے جو تحریک انخلاص وطن کا منبع و مخزن بنا ہے۔

صحبت امروز میں ہم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، اور ندوۃ العلماء لکھنؤ پر گفتگو کرنے بجائے دارالعلوم دیوبند پر اجمالاً گفتگو کریں گے۔ تاکہ ہندوستان کو اندازہ ہو کہ ایک خالص دینی و مذہبی درسگاہ کا تحریک ہندوستان کی تحریک آزادی میں کیا مقام تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تھے۔ اور ان کے پیر و مرشد کا نام نامی حضرت امداد اللہ مکی تھا۔ یہ وہ اکابر تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون میں بیٹھ کر انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ اور شاملی و مظفر نگر یو۔ پی میں انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی۔ انہیں شکست ہوئی۔ اور جس طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے اکثر و بیشتر علمبرداروں کو شکست ہوئی۔ انہیں بھی شکست ہوئی۔ یہ اپنے زمانے کے اکابر اور بزرگ تھے۔ انگریزوں نے جب ظلم و ستم کا بازار گرم کیا تو حضرت امداد اللہ مکی مکہ تشریف لے گئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی گرفتار ہوئے اور چھ مہینے کے بعد رہا کر دیئے گئے۔ ان کے خلاف مقدمہ ثابت نہ ہو سکا۔ مولانا قاسم نانوتوی تین برس تک دیوبند میں مقیم رہے۔ مگر گرفتار نہ ہو سکے۔ اور ان کا گرفتار نہ ہونا آج تک ان کی بزرگانہ کرامت سمجھی جاتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کو کم و بیش ستر سال ہو چکے۔ اور جب مدرسہ قائم ہوا۔ تو یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندوؤں کے چندے دیئے۔ اور نول کشور پریس سے کتابیں پہنچیں۔

اس زمانے کا ہندو ذہنگ نظر نہ تھا۔ اور چونکہ فارسی پڑھنا چاہتا تھا۔ اس لئے
دار العلوم دیوبند سے ہمدردی اور دلچسپی تھی۔ دار العلوم دیوبند کے قیام کے دو
مقاصد تھے۔ ایک تو کتاب السنت کی اشاعت دوسرے آزادئ وطن کا حصول
اور یہ دعویٰ وقتی مصلحتوں کے پیش نظر نہیں کیا جا رہا ہے۔ بلکہ مستند حوالوں سے
ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں مولانا محمد صاحب لدھیانوی نے ایک فتویٰ
مرتب فرمایا تھا۔ جس کا نام نصرت الابرار تھا۔ اس فتویٰ پر مولانا رشید احمد گنگوہی
مولانا محمود الحسن اور تمام علماء دیوبند و علماء ہند کے دستخط ثبت ہیں۔ اس فتویٰ میں
دو باتیں صراحتاً کہی گئیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلمان کانگریس میں شریک ہوں۔ دوسرے
یہ کہ سر سید کا وہ ساتھ نہ دیں۔ اس لئے کہ راجہ بنارس سے ملکر انہوں نے کانگریس
کے خلاف ایک جماعت بنائی ہے۔ یہ تاریخی فتویٰ سنہ ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء) میں مرتبہ
ہوا تھا۔ یہ بحث دوسری ہے کہ سر سید علیہ الرحمۃ کے متعلق اس وقت کے علماء
کرام کا نظریہ صحیح تھا یا غلط تھا۔ سر دست کہنا یہ ہے۔ کہ دیوبندی علماء اور
ہندوستان کے دوسرے علماء کی سیاسی فکر کتنی اور مضبوط تھی۔ اور وہ اب
سے بہت پہلے سیاسی مسائل پر ترقی پسندوں کی طرح غور فرماتے تھے۔

دار العلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا قاسم نانوتوی تھے۔
دوسرے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب تھے۔ تیسرے صدر مدرس شیخ الہند حضرت مولانا
محمود الحسن تھے۔ چوتھے صدر مدرس حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری تھے۔
پانچویں صدر مدرس شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی ہیں۔ اور یہ سب ہی
انگریز کے باغی تھے۔ اور انہوں نے وہ گروہ پیدا کیا۔ جس نے آزادئ ہند آزادئ
ایشیا کیلئے غیر ممالک میں پلان بنائے۔ ان بزرگان دین کو صرف صدر مدرس
نہ سمجھئے۔ بلکہ جدید اصطلاح میں یہ کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر یا چانسلر تھے۔

اور ایک مخصوص مکتب خیال کے بانی تھے۔ دار العلوم دیوبند میں اہتمام کا منصب بھی اہم ہوتا ہے اور دار العلوم کے ممتاز مہتمین میں حضرت مولانا رفیع الدین مولانا محمد احمد بن مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندی اور مولانا حافظ قاری محمد طیب صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جن کا مرتبہ کسی یونیورسٹی کے چانسلر سے بڑا ہے۔ ان بزرگوں میں سے ایک بزرگ انگریزوں کا حامی نہ تھا۔ اور ان میں یہ بحث تو کہ انگریزوں کی خفیہ ریشہ دوانیوں سے دار العلوم دیوبند کس طرح محفوظ رہے لیکن انگریزوں کی وفاداری کا حق ادا کرنا انہوں نے کبھی نہ سیکھا آج بھی حضرت مولانا طیب مہتمم دار العلوم دیوبند اپنی پوری عالمانہ شان کے ساتھ وطن کی ترقی پسندانہ و وطن پروانہ تحریکات کے حامی ہیں اور اگر منصب اہتمام کی گوناگوں مصروفیتیں اجازت دیں تو وہ کھل کر میدان عمل میں آئیں۔

۱۹۰۸ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں سوال ہوا کہ دار العلوم دیوبند کو بند کر دیا جائے مگر اس زمانہ کے وائسرائے نے کہا کہ اگر ایسا ہو تو ملک میں بغاوت ہو جائیگی۔ یہ دیوبند میں ڈاکٹر انصاری مرحوم تو یقینی طور پر دیوبند کے مرید خاص تھے مجاہدین سرحد نے دیوبند سے زندگی پائی اور برسوں پنجاب کر اور پیٹ پر پتھر باندھ کر انگریزوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ سرفروشوں کی تحریک میں دیوبندیوں نے پوری سرگرمی سے حصہ لیا۔ اور آزادیٔ وطن کی جو تحریک شروع ہوئی وہ دیوبندی علماء و فضلا ونلاندہ کے دم سے آگے بڑھی۔ جمیعتہ علماء اور مجلس احرار اسلام کی پوری تحریکیں دیوبند کی صدائے بازگشت ہیں۔

یہ باتیں اختصار سے اس لئے کہی گئیں ہیں کہ نیا ہندوستان ملک کی ذہنی وسیاسی ارتقا میں دار العلوم دیوبند کا مقام سمجھ سکے۔ آج یہ غلط فہمی بہت عام ہی کہ فلاں نے آزادی وطن کی ہمیشہ مخالفت کی ہو اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور دار العلوم دیوبند ہندی مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا ایک بلند مینار ہے۔

مولانا حسرت موہانی

مجھے بادۂ طرب سے بخمار گاہِ قسمت!
جو ملی تو تلخ کامی جو ہوئی تو سرگرانی

ہندوستان کی سیاست میں مولانا حسرت موہانی کا ظہور ۱۹۲۰ء سے بہت پہلے ہوا۔ بلقانی سیاست، لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک اور مسٹر گوکھلے کی سیاست کا کوئی نچوڑ تھا۔ تو وہ مولانا حسرت موہانی تھے۔ مسلم سیاست سے الگ ہو کر ذرا الگ ہو کر مسلمانوں میں پہلی بار کسی نے ہندوستان کا درد محسوس کیا۔ تو وہ مولانا حسرت موہانی تھے۔ ۱۹۱۶ء میں جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں لکھنؤ پیکٹ ہو رہا تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے مشہور کمیونسٹ مفکر کارل مارکس کی تعلیمات پر ایک سیر حاصل مقالہ لکھا۔ روزنامہ اسٹیٹس مین کلکتہ نے ۱۷ مارچ ۱۹۱۶ء کے شمارے میں اس مقالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

یہ کوئی علمی مقالہ نہیں سازش کرنے والوں کی ایک آواز ہے۔ جو سلطنت برطانیہ کے فولادی دیواروں سے ٹکرانا چاہتی ہے۔ یہ آواز بلند ہونے سے پہلے ختم ہونی چاہیئے۔ یہ آواز ایک مسلمان کی ہے۔ جو سلطنت برطانیہ کے وفادار مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتی ہے۔

پاؤنیر (الہ آباد) نے اسٹیٹسمین کے تبصرے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ آواز ہندوستان کی آواز نہیں ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آواز نہیں ہے۔ محض ایک شخص کی آواز ہے۔ جو صدائے صحرا ثابت ہوگی۔ اور اسکا ایک ساتھی ہندوستان میں نہیں ملیگا۔

۱۹۲۰ء سے پہلے (جب مہاتما گاندھی کی تحریک ترک موالات شروع ہوئی) مولانا حسرت موہانی۔ تین خوش قسمت ہندوستانیوں میں تھے۔ جن پر فوجی نگرانی مقرر کی گئی تھی۔ ان کی نقل و حرکت کی نگرانی خفیہ پولیس نہیں کرتی تھی۔ بلکہ فوج کرتی تھی۔

۱۹۲۰ء کے بعد گاندھی جی، مولانا محمد علی کی جیب میں رہنے لگے۔ مولانا محمد علی

کی شخصیت اسقدر غالب تھی کہ ان سے پورا سیاسی ماحول مغلوب تھا۔ مولانا شوکت علی کی بھاری بھرکم شخصیت کا بوجھ بھلا کون اٹھا سکتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا علمی پندار اور سیاسی بصیرت بڑے بڑے فراعنہ کی اکڑی ہوئی گردنیں جھکا رہی تھی ایسے میں مولانا حسرت موہانی کم آمیز ہو گئے۔ بے نیاز رہنے لگے۔ ان کی فکر و نظر نے ایک لائن اختیار کی۔ سوراج پارٹی کے ہنگاموں اور خلافت کمیٹی کے قضیوں سے ان کا برائے نام ہی تعلق تھا۔ گاندھی جی کی قیادت میں جو سیاست پروان چڑھی تھی اس سے مولانا حسرت موہانی الگ الگ سے تھے۔ تشدد اور دہشت انگریزی کے معنی حسرت موہانی وہ نہ سمجھتے تھے جو عام طور پر سمجھے جاتے تھے۔ وہ کانگریس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تو دنیا سہم جاتی کہ کیا ہوگا کہاں بم پھٹے گا۔ کہاں آگ لگے گی۔

۱۹۲۴ء میں جب آل انڈیا کانگریس کا اجلاس احمد آباد میں ہوا تو مولانا حسرت موہانی نے آزادی کامل کی تجویز پیش کی مولانا مسز اینی بیسنٹ کے ہوم رول سے سخت عاجز تھے درجہ ستمرات یا استمراتی آزادی ڈومینین اسٹیس سے سخت بیزار تھے۔ اس لئے کامل آزادی اور برطانیہ سے انقطاع تعلق پر اصرار کرتے تھے چونکہ اس زمانے کے انتہا پسند لیڈروں کے دماغ بھی اس مسئلہ پر صاف نہ تھے۔ اس لئے آزادی کامل کی تجویز مولانا حسرت موہانی نے اجلاس احمد آباد میں پیش کی۔ اس کے بعد وہ کبھی کانگریس کی سیاست سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ اور انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ برطانوی سنگینوں کے سائے میں جو آزادی ملیگی وہ کس کام کی۔

انہیں کانگریس نے بری طرح نظر انداز کیا وہ اچھے انسان اونچے مفکر پکے محب وطن تھے مگر اچھے مقرر نہیں تھے اس لئے ان کا کوئی باقاعدہ گروہ

نہ بن سکا۔ اور وہ کانگریس سے دور ہوتے چلے گئے۔

مسز سروجنی نائیڈو کی زیر صدارت جب کانپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا اور پنڈت جواہر لال نہرو رضا کاروں کے کمانڈر انچیف نامزد کئے گئے۔ تو مولانا حسرت موہانی کو الزام دیا گیا کہ انہوں نے عوام کے ایک طبقہ کو کانگریس کے پنڈال پر حملہ کرنیکی ترغیب دی۔ یہ الزام غلط تھا لیکن اتنی بات سچی تھی کہ ایک طرف کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ دوسرے خیمے میں دنیا بھر کے انقلاب پسند اور کمیونسٹ جمع تھے۔ جو مولانا حسرت موہانی کے ایک اشارے پر جان کی بازی لگا دینے کو تیار تھے۔

اتنے میں پنڈت موتی لال نہرو کی رپورٹ آئی جسے نہرو رپورٹ کہتے ہیں اس رپورٹ میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس پر قناعت کر لینی چاہیئے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ برطانیہ کے زیر سایہ آزادی قبول کر لینی چاہیئے یہ تجویز مولانا حسرت موہانی کیلئے مستقل سبب اشتعال تھی۔ چنانچہ نہرو رپورٹ کا جواب دینے کیلئے جو مسلم کانفرنس قائم ہوئی اس میں مولانا حسرت موہانی بھی بادل ناخواستہ شریک ہو گئے۔

بادل ناخواستہ ہم نے اس لئے کہا ہے کہ مسلم کانفرنس آگ اور پانی کا ایک سیلاب تھی۔ انگریز کے وفاداران ازلی اور انگریز کے باغی مولانا حسرت موہانی ایک جگہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اختلافات شروع ہوئے اور جلد ہی مولانا حسرت موہانی کی رہنمائی میں ایک آزاد مسلم کانفرنس قائم ہوئی۔ اس کے بعد مسلم کانفرنس بھی ختم ہو گئی اور آزاد مسلم کانفرنس بھی ختم ہو گئی۔

اور کم و بیش آٹھ دس برس کے بعد نظریہ پاکستان آیا۔ ہفتہ وار نوید میں جو دریا گنج دلی سے چھپتا تھا مولانا حسرت موہانی اور مسٹر جناح کا ایک مکالمہ ان الفاظ

میں چھپا تھا۔ مولانا حسرت موہانی اسلام پوری دنیا کو ایک قوم بنانا چاہتا ہے اس
لئے میں دو قومی نظریہ کا مفہوم نہ سمجھ سکا۔

مسٹر جناح۔ آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں یہ ایک طریق کار ہے۔

مولانا حسرت۔ میں ایک طریق کار کو صحیح مقاصد پر ترجیح نہیں دے سکتا۔

مسٹر جناح۔ پھر بھی آپ کو میرا ساتھ دینا چاہیئے۔

مولانا حسرت۔ میں غور کرونگا۔

اور ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان بنا تو مسلم لیگی لیڈروں کے فرار کے باوجود
مولانا حسرت موہانی ہندوستان ہی میں رہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جس طرح سپرو کمیٹی
کی رپورٹ پیش کرنے کے باوجود راجہ صاحب پیرپور ۱۹۴۰ء میں مسٹر جناح سے الگ
ہو گئے۔ اور صاف کہدیا کہ جو کچھ کرنا ہو ہندوستان ہی میں کرو۔ میں ملک کی تقسیم
نہیں چاہتا۔ اسی طرح مولانا حسرت موہانی بھی دو قومی نظریہ اور نظریہ پاکستان
سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر رہے
دلی میں قیام کیا اور دستور ساز اسمبلی میں ۸ دسمبر ۱۹۴۹ء کو تقریر کرتے ہوئے
کہا۔

میں آزاد ہندوستان کا والہانہ خیر مقدم کرتا ہوں جو خواب میں نے کبھی دیکھا
تھا۔ اس کی تعبیر آج دیکھ رہا ہوں۔ آپکا اشارہ برسر اقتدار پارٹی کیطرف تھا۔ مجھے
غلط سمجھے میں آپ کو غلط نہیں سمجھا۔

مولانا حسرت موہانی اور مسٹر جناح کا ایک مکالمہ ان الفاظ میں چھپا تھا
مولانا حسرت موہانی کا ۱۹۵۰ء میں انتقال ہو گیا اور وہ ہمیشہ کیلئے خاموش
ہو گیا۔ جسکی آواز آوازِ حق تھی جس نے آزاد ہندوستان کے محل کا سنگ بنیاد
اور اسوقت رکھا جب سلطنت برطانیہ کے سایہ ہمالیہ میں ہندوستان کی

غلامی کو پرواں چڑھانیکی تمنائیں کی جاتی تھیں۔

یہ کردار کا کوئی تضاد نہیں تھا۔ کہ جن حسرت موہانی کو دنیا کمیونسٹ کہتی تھی وہ صوفی ہے اور مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ میں شریک ہوتے۔ جب ماحول ناسازگار ہو جب کمیونسٹ نہ رہے بلکہ دکانیں چمکانے والا سوداگر بن جائے۔ جب آزادی کا نام لینے والے آزادی کی دیوی کے سچے پرستاروں کو غلط سمجھنے لگے تو کمیونزم کی مادہ پرستی کا ردعمل تصوف ہوتا ہے۔ کانگریس کا ایک ردعمل مسلم لیگ بھی ہو سکتی ہے مولانا حسرت موہانی کو امید تھی کہ اگر کانگریس ان کی آزادی کامل کے تصور کی قدر شناس نہیں ہے تو شاید مسلم کانفرنس ہو۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ انہیں کانگریس مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ سب نے مایوس کیا اور جب ہندوستان کو واقعی آزادی ملی تو مولانا کیلئے دیر ہو چکی تھی۔ اور قدم بدلنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی تنگر کلمہ قلم ہے کہ ان کی موت اس ہندوستان میں ہوئی جس کی آزادی کامل کا خواب انہوں نے گاندھی جی سے پہلے دیکھا تھا۔

خود انہوں نے اپنے متعلق فرمایا ہے کہ اک طرفہ طبیعت ہے۔ حسرت کی طبیعت بھی ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی مولانا حسرت موہانی کا معمولی زندگی یہ تھا کہ کپڑے پھٹے ہیں۔ جوتا پھٹا ہے۔ کانپور کے بازاروں میں سبزی اور گوشت خرید رہے ہیں۔ کسی نے دست سوال دراز کر دیا تو جیب میں جو کچھ ہوا دیدیا۔ اور پھر فاقہ ایک فاقہ دو پھر فاقہ تیسرا فاقہ اور فاقے پر فاقہ اردوئے معلی باستقلال نکال رہے ہیں تو خود ہی ایڈیٹر خود ہی چپراسی ہیں۔ اخبارات کا بنڈل کاندھے پر ہے اور ڈاک خانہ جا رہے ہیں کسی مزدور نے سمجھا کہ میں بوجھ اٹھا لوں تو کہا میں بھی تو مزدور ہوں ایک بطل جلیل جو قصر آزادی کا پہلا معمار تھا جس نے مزدوروں اور کسانوں کا انقلاب برپا کرنے کی ٹھانی تھی۔ جس نے سیراٹ اور [illegible] کمیونسٹ کو ایک دیکھا اور انقلاب کا درس تھا جس سے کانگریس کو کانگریس بنانا چاہا تھا۔ جو تھے آزادی خیال کی پرواز

پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی اونچی تھی۔ جو کردار کے اعتبار سے
گاندھی جی کا ہمسر تھا۔ جو تخیل کی بلندی کے اعتبار سے پنڈت موتی لال نہرو کو خاطر
میں نہ لاتا تھا۔ جو شاعری کے میدان کا امام تھا۔ اور رئیس المتغزلین کہلاتا تھا جس کی
فکرر مسٹر جناح کو منزلوں پیچھے چھوڑ چکی تھی۔ وہ مرا تو اس طرح مرا کہ آزاد ہندوستان
اسے بھول گیا۔ انقلاب پسندوں کو وہ کبھی یاد نہ آیا کمیونسٹوں نے اسے قابل اعتناء نہ
سمجھا اور پاکستان

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی !!

دلی میں تلک مارگ بن سکتا ہے لیکن حسرت مارگ کی نسبت ایک حسرت تعمیر ہے
اک تیر ایسا سینہ مار اگر ہائے ہائے۔
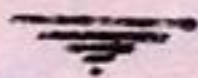
حیاتِ اجمل کے سیاسی نقوش

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب اپنوں کے غداری اور بیگانوں کے جبر و تشدد سے انگریز پورے ہندوستان پر اپنا تسلط جمانے میں کامیاب ہو گیا تو ایک طرف اسلامیانِ ہند کے سینوں میں وطن کا ایک نیا جذبہ ابھرا اور دوسری طرف انگریز مسلمانوں کو سرزمینِ ہندوستان سے نیست و نابود کر دینے کی مکر و سازش کا تانا بانا تیار کرنے لگا۔ اس کا عیار دماغ بھانپ چکا تھا کہ جب تک مسلمانوں میں اسلام کی محبت اور جہاد جیسا ایثاری جذبہ موجود ہے ہندوستان سے اس کے تخت مغرب اند چلنے پر کسی وقت بھی مجبور کئے جانے کے امکانات ختم نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہی وہ دولت ہے جو مسلمانوں میں اپنی بے سرو سامانی اور تہی دامنی کے باوجود بڑی سے بڑی طاغوتی طاقت سے ٹکرا جانے کی ہمت پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ اسلام کے نام لیواؤں کو اقتصادی طور پر پامال کرنے کیلئے ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے۔ تجارت کے میدان میں غیر مسلموں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ مسلمانوں کی وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل جو اسلام کی محبت اور جذبہ جہاد کا حاصل تھی کو انتشار و افتراق کا شکار کرنے کی سعیٔ نامسعود کی جانے لگی۔ اسی کوشش نے آگے جا کر قادیانیت کا روپ دھار لیا۔ کشاکش کے اس دور میں دہلی کا ایک طبیب خاندان انتہائی خاموشی سے خدمتِ خلق میں مصروف تھا۔ اسی خاندان میں حکیم اجمل خاں نے آنکھ کھولی ان کے والد محمود خان ان دنوں ریاست رامپور سے وابستہ تھے۔ حکیم محمد اجمل خاں نے اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید سے فنِ طب کا وہ عظیم ورثہ حاصل کیا جو کئی پشتوں سے ہوتا ہوا ان کے سینوں میں محفوظ چلا آ رہا تھا۔ عربی اور فارسی علوم کی دولت سے اپنا دامن بھر اور شعر و ادب کی وادیوں سے گزرتے شعور کی حد پر آ پہونچے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان بھر کے رہنماؤں

سیاسی اور غیر سیاسی انجمنوں کو نواب رامپور کی سرپرستی حاصل تھی۔
اور رامپور کا دربار جلیل القدر رہنماؤں سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کے مواقع میسر آتے رہے۔ جس سے ملک کا سیاسی اور معیشی آپ کے قلب و جگر کو دعوت د دینے لگا اور یہیں پر حکیم صاحب کے سیاسی شعور کی پرورش ہوئی۔
۱۹۰۰ء کے بعد ملک سیاسی اعتبار سے ایسے موڑ پر آگیا کہ مسلمان بھی اپنی سالمیت اور اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے ایک علیحدہ تنظیم کے امکانات پر غور و فکر کرنے لگے تھے۔
چنانچہ ۱۹۰۶ء میں نواب سلیم اللہ کی زیر صدارت ڈھاکہ میں مسلم رہنماؤں کا وعظیم الشان اور تاریخی اجلاس ہوا جس میں مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ صدارت کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اور اس کی تائید کا اعزاز حکیم محمد اجمل خاں کے حصہ میں آیا۔ دراصل حکیم صاحب ۱۹۰۱ء سے ہی اس بات پہ زور دے رہے تھے کہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ پلیٹ فارم پر اپنی تنظیم کرنی چاہیئے۔
۱۹۰۶ء کا اجلاس ان کے رسمی خواب کی تعبیر تھا۔
اب تک حکیم صاحب ان لوگوں کے ہمنوا تھے جو خلوص نیت سے یہ سمجھتے تھے کہ بدیسی آقاؤں سے لڑ بھڑ کر ہم ان سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے بلکہ ان کی رفاقت میں کام کر کے ہی ان سے اپنے حقوق منوائے جا سکتے ہیں۔
لیکن جب ٹریوبلی اور بلقان کی جنگوں کے ذریعہ مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی گئی تو حکیم صاحب میں بھی ایک ذہنی انقلاب پیدا ہوا اور وہ جان گئے کہ انگریز مسلمانوں کا دوست نہیں ہو سکتا۔
اسی ذہنی انقلاب نے حکیم صاحب کو سوچ اور فکر کے زاویے بدل

دیئے۔ پہلی جنگ عظیم میں جب ترکی میدان میں کود پڑا تو حکیم صاحب نے عملی طور پر انگریز سے ترک تعاون کا اعلان کر دیا۔ اور انگریز کے مسلم کش رویے کے خلاف احتجاج کے طور پر حاذق الملک کا خطاب واپس کر دیا۔ اور قیصر ہند کا تمغہ جو حکیم صاحب کی خدمات کے اعتراف میں انگریز نے انہیں عطا کر رکھے تھے۔ عطائے تو بہ تو لوٹا دیا۔ حکیم صاحب کے اس جرأت مندانہ اقدام نے نئی راہیں پیدا کر دیں۔ وہاں عوام کے دلوں میں حکیم صاحب کی عزت وعظمت کو اور بھی بڑھا دیا۔ انہیں دنوں جمیعۃ العلماء کے ایک تاریخی اجلاس میں حکیم صاحب کی ملکی وملی خدمات کے اعتراف میں انہیں مسیح الملک اور رئیس العلماء کے خطابات سے نوازا گیا۔ مرتے دم تک قوم کا عطا کردہ یہ اعزاز حکیم صاحب کیلئے سرمایۂ افتخار رہا۔

اسی اثناء میں ریشمی رومال کی تحریک کا انکشاف ہوا۔ اس سازش میں جہاں حضرت مولانا عبداللہ سندھی کو ماخوذ وملوث کیا گیا ہے۔ وہاں حکیم صاحب بھی برطانوی سرکار کی مشکوک نگاہوں سے بچ نہ سکے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک انگریز کے نہاں خانۂ دماغ میں یہ شک جاگزیں رہا کہ حکیم صاحب بھی اس سازش میں شریک کار ہیں۔ حکیم صاحب کی نقل وحرکت پر کڑی نگرانی رکھی جانے لگی۔ اور ان کی ذاتی ڈاک بھی سنسر کی نذر ہونے لگی۔ لیکن بعد کے واقعات نے اس بیجا شکوک وشبہہ کو قطعی بے بنیاد ثابت کر دیا۔

جنگ کے دوران حکیم صاحب نے ہندو مسلم اتحاد کو اپنا عزیز ترین نصب العین بنا لیا۔ اور اس کے حصول کیلئے سرگرم کار رہنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کا ہر عظیم رہنما حکیم صاحب کے مکان کو ہی شرف میہمانی بخشتا تھا۔ اور یہیں اکثر تحریکوں کے سلسلے میں مشورے ہوا کرتے تھے۔

لیکن ہندو مسلم اتحاد سے حکیم صاحب کی یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ مسلمانوں کو یہ حیثیت ختم کرکے ہندو اکثریت میں مدغم کردیا جائے۔ یا ان سے یکسر دستبرداری اختیار کرلی جائے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں جب مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان لکھنؤ پیکٹ ہوا تو حکیم صاحب ہی تھے جنہوں نے اس بات پر زور دیا کہ پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کو برقرار رکھتے ہوئے باقی صوبوں میں مسلمانوں کیلئے مخصوص ہوجانی چاہیئں۔

اگرچہ حکیم صاحب کی سیاسی مصروفیات دن بدن بڑھ رہی تھیں لیکن مطب کے ساتھ ان کے بے پناہ عشق اور والہانہ شیفتگی نے اس فن عزیز کو نظرانداز نہ ہونے دیا۔ ان کے دل میں ایک عرصہ سے یہ آرزو مچل رہی تھی کہ طب یونانی کو جدید سائنسی تقاضوں کے مطابق ڈھال دیا جائے۔ اور اس کی تعلیم کو جدید سائنسی طریقوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے طبی قائم کیا جائے۔ ان کا یہ خواب ۱۹۱۶ء میں شرمندہ تعبیر ہوا۔ جب اسوقت کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے ایشیا کے سب سے بڑے آیورویدک و یونانی طبی کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس کالج کو کامیابی سے چلانے کیلئے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کی تکمیل کیلئے دہلی میں ہی انہوں نے ہندوستانی دواخانہ کے نام سے ایک عظیم مطب کھولا۔ جس کی کل آمدنی طبی کالج کے مصارف پورے کرتی تھی۔

اسی طرح حکیم صاحب نے محسوس کیا کہ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع سے محروم رکھا جارہا ہے۔

اور جو چند مسلم طلبہ حصولِ علم کے لئے جاتے ہیں انہیں تحقیر و تذلیل کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ اور جس قسم کی تعلیم ان اداروں میں دیجارہی ہے وہ اسلامی تعلیمات سے صریح بغاوت کے جراثیم پیدا کررہی ہے۔

دوسری طرف وہ سرسید احمد خاں اور سرسید کی طرح یہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمان اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرتے ان کے لئے سیاسی طور پر ابھرنا اور حکومت کے کاروبار میں حصہ لینا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ان کے اس احساس نے جامعہ ملیہ کو ختم کردیا۔ جس کی فلاح وبہبود اور بقا واستحکام کے لئے شب وروز کام کرنے لگے۔

یہ حکیم صاحب ہی کی جان توڑ اور بے غرض مساعی کا نتیجہ تھا کہ جامعہ ملیہ اپنے مقاصد اور اپنے طریق تعلیم کے اعتبار سے ملک کا ایک باوقار ادارہ بن گیا۔ اس ادارے نے آزادی کا شعور بیدار کرنے میں اور مسلمانوں کے لئے باعزت مقام حاصل کرنے کے سلسلہ میں بے حد کام کیا۔ اور ایک ایسا ذہن پیدا کیا جو بالآخر انگریز کے ہندوستان چھوڑنے کا موجب بنا۔

۱۷-۱۹۱۸ء میں جب ملک کے تمام جلیل القدر مسلمان رہنماؤں کو انگریز دشمنی اور آزادی کے خواب دیکھنے کے سلسلے میں گرفتار کرلیا گیا اور ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں بے چینی اور اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی اور نظر بند رہنماؤں کی رہائی کے مطالبے نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی تو اس تحریک کو منظم طریق پر چلانے کیلئے انجمن نظر بندان اسلام قائم کی گئی۔ جس کی شاخیں تمام صوبوں میں پھیل گئیں۔ اس انجمن کے خازن بھی حکیم صاحب ہی بنائے گئے۔ جنہوں نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک لیجانے کے لئے اپنے ذاتی اثاثہ کی قربانی تک سے بھی دریغ نہ کیا۔

اس کے بعد حالات نے برق رفتاری اختیار کرلی۔ اور حالات کی کوکھ سے رولٹ ایکٹ اور خلافت کے ہنگاموں نے جنم لیا۔

اس کے ساتھ عدم تعاون کی تحریک منظم طور پر شروع ہوگئی۔ ہر محاذ

پر حکیم صاحب کی مخالفانہ مساعی اور بے غرض قیادت نے قوم پرستوں کو ایک نئی قوت اور ایک نیا جذبہ عطا کیا۔

۱۹۲۱ء میں آپ خلافت کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اور اس ذمہ دارانہ حیثیت میں اپنی روشن دماغی اور روشن ضمیری سے اسلامیان ہند کی رہنمائی کرتے رہے اسی سال احمد آباد میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا جس کی صدارت مسٹر سی آر داس کو کرنا تھی لیکن برطانوی حکومت نے انہیں عین موقعہ پر گرفتار کر لیا۔

اور وہ اس اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ سی آر داس کی غیر حاضری میں ان کی جانشینی کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہو گیا۔

بالآخر اس آڑے وقت میں بھی حکیم صاحب کی ذات گرامی کام آئی۔ آپ نے اس اجلاس کی صدارت کی اور کانگریس کی تاریخ میں پہلی بار اردو میں خطبہ صدارت پڑھا۔

اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو کانفرنس بھی کر ڈالی۔

۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے تمام رہنماؤں کی شدید مخالفت کے باوجود انجانی وجوہات کی بناء پر عدم تعاون کی تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور اس کے فوراً بعد مسلمانوں کو پامال کرنے اور اسلام کو ہندوستان سے ختم کرنے کیلئے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں پھوٹ پڑیں۔ جس کے نتیجہ میں دوسرے مسلمان رہنماؤں کیطرح حکیم محمد اجمل خاں کو بھی ہندوستان کے ہاتھوں و تذلیل کا نشانہ بننا پڑا۔

اس سے حکیم صاحب کے اعتماد کو سخت دھچکا لگا۔ بعد کے واقعات نے ان کی آرزوؤں اور توقعات کو اور بھی صدمہ پہنچایا۔ جب کہ ۱۹۲۴ء میں ہندو مسلم فسادات کا لاوا پھوٹ نکلا۔

اور کانگریس کے معاندانہ اور مسلم آزار رویے نے حکیم صاحب کو بالکل بددل کر دیا۔ اور وہ عملاً سیاسیات سے کنارہ کش ہو گئے۔ شبادروز کام نے ان کی صحت کو پہلے ہی ہلا کر رکھ دیا۔

۱۹۲۱ء میں یورپ اور مسلم ممالک کے دورے پر روانہ ہو گئے۔

بالآخر ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو رامپور میں اس عظیم رہنما کی زندگی کا آفتاب غروب ہو گیا۔ یہ اس عظیم انسان کی داستان جمیل کا ایک ورق جس کی زندگی سدا بہار اور خوش رنگ پھولوں کا ایک گلدستہ تھی۔ جس کی مہک آج بھی دلوں کو معطر اور دماغوں کو منبعر کر رہی ہے۔

وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے طبیب، ایک عظیم سیاسی رہنما، ایک خوش فکر شاعر اور ایک صاحب طرز ادیب تھے۔

حضرات اسی قسم کے لوگ تھے جن کے کارناموں سے ہماری ملی تاریخ عبارت ہے۔

انہی لوگوں نے ہمارے غلام ذہنوں کو آزادی کا شعور بخشا۔ برطانوی طرح کے جبر و تشدد میں پسے ہوئے انسانوں کو وہ قوت عطا کی کہ وہ غیر ملکی آقاؤں کے گریبانوں سے کھیلنے پر تیار ہو گئے۔

یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے وقت کی تنابیں کھینچ کر اس کا رخ بدل دیا حالات کے دھارے موڑ دیئے تاریخ کو بھی رفتار بدلنے پر مجبور کر دیا۔ حکیم اجمل خاں سے لیکر قائداعظم کے دور تک کی داستان اسی قسم کے ایثار پیشہ اور پیکر اخلاص رہنماؤں کے تابندہ کارناموں سے جگمگا رہی ہے۔

ان عظیم انسانوں کی یاد ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔ اور ان کی یاد منانا ہمارے ملی فرائض ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان عظیموں کو وقت کی گرد میں گم نہ ہونے دیں

لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے یہاں کوئی ایسا ادارہ یا ایسی انجمن موجود
جو ملت کے ان درخشاں ستاروں کی یاد منا سکے جس کا نتیجہ یہ ہے۔
کہ ہم رفتہ رفتہ ان لوگوں کو بھولتے جا رہے ہیں جنہوں نے اپنی بے لوث
قربانیوں سے ہماری تاریخ مرتب کی۔

۲۵ دسمبر نے وقت کا سب سے بڑا انسان پیدا کیا جس کی چٹانی عزم نے ایک
شاعر کے خواب کو دنیا کے نقشہ پر سب سے بڑی اسلامی سلطنت کی صورت میں
تعبیر بخشی لیکن وہ دن سیالکوٹ کے گلی کوچوں سے جس حسرت و یاس سے گذر
گیا وہ افسوس ناک ہی نہیں الم ناک بھی ہے۔ صرف ڈائرز گلڈ کے اراکین کو ہی
یہ سعادت نصیب ہو سکی کہ انہوں نے قائد اعظمؒ کی یاد میں ایک مشاعرہ کا اہتمام
کر دیا قومیں اپنے اسلاف کو فراموش کر دیتی لیکن وقت انہیں کبھی معاف
نہیں کرتا۔

میں یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ملک و ملت کے مایہ ناز فرزندوں
کی یادیں منانے کیلئے ایسی انجمن معرض وجود میں لائی جائے جو سیاسیات سے
الگ تھلگ رہ کر اپنے دینی اور سیاسی رہنماؤں کو خراج عقیدت پیش کرنے اور
ان کے سیرت و کردار کی روشنی کو عام کرنے کا اہتمام کیا کرے۔

ہندوستان کا جاں نثار سپوت

مولانا مظہر الحق مرحوم

مولانا مظہر الحق مرحوم ایک ممتاز نیشنلسٹ ایک عظیم محب وطن، جنگ آزادی کے جانثار سپاہی اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے، وہ ان کا توانا شعور اور زندہ ضمیر تھا۔ جب انہوں نے یہ محسوس کر لیا۔ کہ جن قدروں کیلئے وہ زمانے سے برسرپیکار رہتے۔ سیاسی مفاد کی خاطر پامال اور مسخ کیا جا رہا تھا۔ اعلانیہ سیاسی اور عوامی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کیا ہندوستانیوں میں کوئی ایسی مثال پیش کر سکتا ہے۔ کہ کسی نے محض اسی بنار پر انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت کو ٹھکرا دیا۔ کہ جن پالیسیوں پر وہ کاربند تھی۔ ان میں سے کچھ نظر ثانی کی محتاج رہی ہوں۔ پٹنہ کا مشہور و معروف تاریخی صداقت آشرم انہیں کا قائم کیا ہوا ہے۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے بانیوں میں تھے۔

مگر آج اس عظیم شخصیت کو اس کی وطنی ریاست (بہار) سے باہر شاید ہی کوئی جانتا ہوگا۔ مگر ان کے سیاسی معاصرین کے دلوں پر ان کی خدمات اور قربانیوں کی یادیں نقش ہیں۔ جنہوں نے اپنی تصنیفات میں بڑے ادب و احترام سے ان کا ذکر کیا۔

مولانا مظہر الحق مرحوم پٹنہ کے ایک نواحی گاؤں بہپورہ میں ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن ہی سے غیر معمولی طور پر تیز اور ذہین تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔ ۱۸۸۶ء میں پٹنہ کالجیٹ اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اور لکھنؤ کے کیننگ، اسکول میں داخلہ لیا۔ پھر قانون کی تعلیم کے لئے انگلینڈ گئے۔ جولائی ۱۸۹۱ء میں وہ کلکتہ ہائی کورٹ کے وکالت خانہ میں شامل ہو گئے۔ پھر پٹنہ میں پریکٹس شروع کی۔ مگر بعد ازاں اتر پردیش میں منصف بن کر چلے گئے۔ ۱۸۹۶ء میں منصفی سے مستعفی ہو کر چھپرہ (بہار) میں پریکٹس کرنے لگے۔ ۱۹۰۶ء میں پٹنہ چلے گئے۔ جہاں ایک ممتاز بیرسٹر کی حیثیت سے ان کی بڑی شہرت ہوئی۔ ۲۱-۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون میں حکومت سے منحرف ہو کر پریکٹس ترک کر دی۔

ضلع سارن (بہار) کے ایک گاؤں فرید پور میں ۲ جنوری ۱۹۳۰ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس گاؤں میں انہوں نے "آشیانہ" کے نام سے ایک بنگلہ بھی تعمیر کیا تھا جو آج بھی موجود ہے۔ اور وہ وہیں دفن ہوئے۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ اور ایک لڑکے حسین مظہر موجود ہیں۔ مولانا مرحوم کی کچھ تصنیفات بھی ہیں۔ مولانا مظہر الحق مرحوم گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سطح کے لیڈر تھے۔ ان کی زندگی اور خدمات پر شری شیواجی راؤ نے انگریزی میں ایک کتاب "دی میسج آف آشیانہ" کے نام سے لکھی ہے۔ (The message of Ashiana) جس کا اردو اور ہندی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

مہاتما گاندھی نے ان کی وفات پر اپنے تعزیتی پیغام میں لکھا تھا۔ کہ مظہر الحق ایک عظیم محب وطن ایک صالح مسلمان اور فلسفی تھے۔ عدم تعاون کی تحریک شروع ہونے تک ان کی زندگی جاگیردارانہ ٹھاٹ باٹ کی تھی۔ مگر اس کے بعد وہ بالکل صوفی منش ہو گئے۔ وہ کسی ستائش کے جذبے کے بغیر گوشہ گیر ہو گئے۔ اور قوم وطن کی خدمت میں پورے خلوص کے ساتھ منہمک رہنے لگے۔ وہ اپنی تقریر اور عمل دونوں میں یکساں طور پر نڈر اور بے باک تھے۔ ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائیگی۔ اور ملک کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر ان کی کمی اور بھی شدت سے محسوس کی جائیگی۔

پیغامات

یوں تو ایسی شخصیت ہر زمانہ میں نایاب رہے گی مگر ملک کی تاریخ کے موجودہ دور میں تو ایسی ہستی کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیگی —

— مہاتما گاندھی

ہر لوگوں کی عظیم ترین تحریک عدم تعاون میں مولانا مظہر الحق نے نمایاں حصہ لیا۔ وہ اس تحریک کے بہت ہی معروف رہنما تھے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان کی یاد منائیں اور ان کو خراج عقیدت پیش کریں۔

جواہر لال نہرو۔

میں یہ معلوم کر کے بے حد مسرور ہوں کہ مشہور و ممتاز محب وطن مظہر الحق مرحوم کی مستقل یادگار کیلئے مظہر الحق میموریل بورڈ قائم کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد

مظہر الحق مرحوم ایک عظیم المرتبت نیشلسٹ اور سوشل ریفارمر تھے

صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشن

وہ (مولانا مظہر الحق مرحوم) ایک عظیم المرتبت قوم پرست تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء میں بڑا نام پیدا کیا تھا"

وزیر اعظم لال بہادر شاستری

حق کا مظہر:۔ ہم آج آزاد ہیں۔ ہندوستان آزادی کی شاہراہ پر گامزن ہے لیکن آزاد ہونے سے پہلے اس سفر کے شروع ہونے سے پہلے رخت سفر تیار کرنے میں کتنے انمول دلوں کی دھڑکنیں، کتنی شعلہ فگن آرزوؤں کی کاوشیں۔ کتنے شہیدوں کے خون کی تڑپتی لالی کتنے خیالوں کی قوس و قزح اور کتنی مجسم داماں باغ بانی وکف گل فروش غنچوں کے حسن و دلکشی، رنگینی و خوشبو، کشش و لطافت سے بوجھل بوجھل قربانیوں، خود فراموشیوں اور خود سپردگی کی بے ساختگی تازگی اور گرمی شامل تھی۔ شاید اس کی صحیح تعداد وقت کا محتسب اور زمانہ کا مورخ نہ گنا سکے۔ لیکن جب کبھی یاد میں زندہ نقوش کے چراغ جلائے: صداقت آشرم۔ کے سامنے سے گذریں گی تو ہندوستان کے ایک سچے وطن پرست جاں نثار سیرت اور جاں باز مجاہد کے قدموں

میں محبت اور عقیدت سے جھک جائیں گی۔

وہ انسان دل و دماغ کے تمام نیک اور اعلیٰ جذبات اور شگفتہ و پاکیزہ کیفیتوں کا "مظہر تھا"

اور یہ حق کی بات تھی۔ کہ باپو نے بھرپور سچائی کے ساتھ یہ کہا۔ (وہ ان میں سے تھے) جن پر میں ہر ضرورت کے وقت کامل اعتماد کر سکتا تھا۔ ایسی شخصیت ہر دور میں نایاب رہے گی۔

جنگ آزادی کا یہ سپاہی، سپاہی جس شعوری حق اور سیاسی دیانتداری کا مظہر تھا۔ وہ ہماری تاریخ کے کسی سپوت کا خاصہ نہیں رہا۔ جس مقصد اور منزل کے لئے انہوں نے ایک بھرپور کامیاب دنیاوی زندگی کا چھوڑ کر سیاسی سنیاس لیا جب وہی سیاسی مفاد عامہ پر قربان جانے لگیں۔ تو انہوں نے نہ صرف "صداقت آشرم" کی پناہ میں کنارہ کشی اختیار کر لی۔ بلکہ کانگریس کی صدارت کو بھی قبول نہ کیا۔

بہار کے خنک ضمیر سے بنے مظہر الحق نے سیاست کو وہ صداقت و شرافت دی کہ زمانہ کو کہنا پڑا۔ سیاست۔ شرافت کی رزمگاہ ہے۔ مولانا مظہر الحق مرحوم جنگ آزادی کی باتیں پرانی ہو جائیں۔ لیکن مولانا کی عظمت حکمت اور شرافت کی بات ہمیشہ ایک زندہ سبق رہے گی۔

مظہر حق۔ کتنا زندہ نام تھا۔ اور آج بھی یہ مسئلہ غور و فکر کا موضوع ہے۔ کہ وہ سر تھے یا مولانا۔ اور ہم صرف یہ سمجھتے ہیں کہ وہ "مظہر حق" تھے۔ اور "صداقت آشرم" کو جنم دینے والے تھے۔ جس نے راجن۔ انوگرہ اور جانے کون کون اور کتنے مجاہد پیدا کئے

ختم شد

رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ!

مولانا محمد علی کی زندگی کے ایک گوشے کو ہم نے بیان کیا ہے۔ مولانا محمد علی تو بڑی جامع صفات شخصیت تھے۔ وہ ایک بلند پایہ صحافی شعلہ بیان مقرر جادو نگار ادیب نعرہ گو شاعر اور سب سے بڑھ کر ملک کی تحریک آزادی کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے۔ کہ انہوں نے ملک کی آزادی کی قیادت کی۔ اور برطانوی سامراج کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا۔ محمد علی اسلام کے پرستار تھے۔ اور اس بنا پر ملک کی آزادی کے علمبردار تھے۔ مولانا پر یہ حقیقت بھی آشکار ہو گئی کہ مشرق وسطی کے اسلامی ممالک کی آزادی کیلئے ضروری ہے کہ ہندوستان آزاد ہو۔ مولانا کی یہ رائے کسقدر صائب تھی۔ اس کا اندازہ موجودہ واقعات سے ہوتا ہے۔ کہ برصغیر پاک وہند ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا اور چند ہی برسوں میں انگریز کو مجبوراً اسلامی ممالک سے دست کش ہونا پڑا۔

۱۹۱۹ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا محمد علی نے ملک کی تحریک آزادی کا پروگرام مرتب کیا۔ ۱۹۱۹ء میں برطانوی سامراج اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ جرمنی کو شکست دینے کے بعد انگریزوں کی سطوت وشوکت میں بے حد اضافہ ہو چکا تھا۔ اور بلاشبہ انگریز اس دور میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ ہندوستان کی فضا آزادی کیلئے سازگار نہ تھی۔ یہ تسلیم ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں تحریک آزادی کا کسقدر چرچہ تھا۔ مگر ملک کی عام آبادی تحریک آزادی سے بیگانہ تھی انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد بے حد ظلم وتشدد اور وحشیانہ بربریت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آزادی کے بعد لوگوں میں آزادی کی آرزو افسردہ ہو کر رہ گئی تھی۔

سرکار برطانیہ کی برکات عوام وخواص کی زبان پر تھیں پیشتر مذہبی پیشوا انگریزی سرکار کے ہمنوا تھے۔ اور انگریزوں کے سائے تلے ریاستی حکمران

اور جاگیردار عوام کو کچل رہے تھے ملک بھر میں پولیس راج تھا۔ ملک کو غلامی سے نجات دلانے کیلئے قومی پیمانے پر تحریک آزادی کو منظم کرنے کی ضرورت تھی تاکہ برطانیہ جیسی جابر قوت کو شکست دیجائے۔ اس عظیم مقصد کیلئے عوام میں جذبہ حریت و آزادی پیدا کرنے کی ضرورت تھی کہ وہ وطن کی آزادی کیلئے اخلاص وایثار سے کام لیں۔ اور سامراجی قوتوں کے خلاف برسرپیکار ہوں۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جو مختلف اقوام اور صوبوں میں بٹا ہوا تھا یہ جذبہ پیدا کرنا بہت ہی مشکل اور منزل ہفت خواں سر کرنے کے مترادف تھا۔ ملک کے اکثر و بیشتر سیاسی کارکن اعتدال پسند تھے۔ ان نازک حالات میں مولانا محمد علی نے ملک میں تحریک آزادی منظم کرنیکا فیصلہ کیا۔

ہندوستان کے عوام نہتے اور بے دست و پا تھے۔ اس بنا پر مسلح بغاوت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ان حالات کے پیش نظر برطانیہ حکومت کا مقابلہ کرنے کیلئے یہی راستہ تھا کہ حکومت سے عدم تعاون کیا جائے۔ سرکاری ملازم اپنی ملازمت ترک کر دیں طالب علم سرکاری درسگاہوں کو خیرباد کہیں۔ سرکاری عدالتوں کا بھی بائیکاٹ کیا جائے۔ وکیل اپنی پریکٹس چھوڑ دیں نیز عوام سول نافرمانی کریں ان انقلاب آفریں تجاویز کو عملی جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پہلی منزل تو ملکی سیاسی جماعتوں سے ان پروگرام کی منظوری تھی چنانچہ مولانا محمد علی اور گاندھی جی نے خلافت اور کانگریس سے ترک موالات کا پروگرام منظور کرایا دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں یہ فیصلہ کیا گیا اور مولانا محمد علی نے ملک بھر میں تحریک کا آغاز کیا۔ چند ہی دنوں میں ترک موالات کی تحریک ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔

محمد علی کی ولولہ انگیز تقریروں نے ملک بھر میں ایک آگ لگادی۔ ہزاروں لوگوں نے سرکاری ملازمتیں ترک کر دیں۔ لاکھوں رضاکار جیل جانے کیلئے آمادہ

ہو گئے ۔ لاکھوں عوام ذوق آزادی سے اسقدر سرشار تھے کہ وہ لاٹھیوں اور گولیوں کی پرواہ نہ کرتے تھے ۔ نوجوان آزادی کی راہ میں اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے ۔ اگر فوج یا پولیس کی گولیوں سے ایک مجاہد آزادی شہید ہوتا تھا تو بیسوں ان کی جگہ لینے کیلئے تیار رہتے تھے ۔ ہزاروں طالب علموں نے اپنی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا کہ تحریک آزادی میں شرکت کی لوگ بدیشی کپڑوں کو ڈھیروں کی صورت میں جمع کرتے اور ان کو آگ لگا دیتے ۔ جب مقرر جلسوں میں تحریک آزادی کیلئے چندہ مانگتے تو عورتیں اپنے زیور تک اتار کر دیدیتیں ۔ غرضکہ تحریک آزادی ملک میں بڑے بھرپور طور پر جاری ہو گئی ۔ برطانوی حکمرانوں کا خوف عوام کے دلوں سے نکل گیا ۔ بلکہ جو شخص برطانوی حکومت کے ہمنوا تھے انہیں شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ۔

اور وہ حالت یہاں تک ہوئی کہ حکومت کے ہمنوا حضرات کو عوام اپنے قبرستانوں میں مردے بھی دفن نہ کرنے دیتے تھے ۔

اس فضا پر کرنے میں سب سے زیادہ مولانا محمد علی کا حصہ تھا جنہوں نے خود اپنے ذاتی ایثار سے عوام کی رہنمائی کی ۔ اس اعتبار سے محمد علی تحریک آزادی کے سب سے بڑے ہیرو کی حیثیت رکھتے تھے ۔ تحریک آزادی ملک بھر میں بڑے زور شور سے جاری تھی کہ ستمبر ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی گرفتار کر لئے گئے ۔ اور ان پر کراچی میں مقدمہ چلایا گیا اس مقدمہ میں مولانا محمد علی کے بیانات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے موقف کی بڑی جرأت و ہمت سے تشریح کی ۔ اور بعد شروع اس جرم کو قبول کیا کہ وہ ہندوستان سے برطانوی راج کا خاتمہ چاہتے ہیں ۔ مولانا محمد علی اور ان کے رفقاء کو دو دو سال قید کی سزا دی گئی ۔ محمد علی کے قید ہونے سے تحریک آزادی میں نئے جوش و خروش کا آغاز ہوا ۔ محمد علی کی والدہ بی اماں

اور بیگم محمد علی نے ملک بھر میں دورے کئے۔ غرضیکہ محمد علی کی قید بھی تحریک آزادی میں اضافہ کا موجب تھا۔ انگریز حکومت مفلوج ہو چکی تھی۔ سارا ملک آزادی کے نعروں سے گونج رہا تھا عجب اخلاق و ایثار کی فضا تھی چشم فلک نے ایسا نظارہ کبھی نہ دیکھا ہو گا۔ ملک بھر میں بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ عوام کی قیادت نہایت مخلص اور قابل رہنماؤں کے ہاتھ جو عصبیت سے بالاتر تھے۔ ملک آزادی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت چند دنوں کی مہمان ہے۔ مگر اس دور میں بعض عصبیت پسند ہندو تحریک آزادی کی اس روش سے پریشان تھے۔ جن میں پنڈت مدن موہن مالویہ پیش پیش تھے۔ مالوی جی نے مہاتما گاندھی کو بنارس یونیورسٹی کا رخ نہ کرنے دیا اس طرح ترک موالات کی مخالفت کی۔ مگر اس کے باوجود گاندھی جی مالویہ سے متاثر نہ تھے۔ مالویہ اس بات سے خائف تھا کہ ملک کی تحریک آزادی میں مسلمان فعال عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں نیز تحریک آزادی میں انقلابی عناصر کا غلبہ ہے۔ اگر اس مرحلہ پر ملک آزاد ہو گیا تو اقتدار پرجوش نوجوانوں کے ہاتھ ہو گا جو کہ مذہبی تعصب سے بلند ہوں گے۔ اور اسطرح پنڈت مالویہ کے رام راج کے منصوبے آشنائے تعمیر نہ ہوں گے۔

پنڈت مالویہ نے ہندوؤں کو اس بات سے خوفزدہ کیا کہ انگریزوں کے چلے جانیکی صورت میں افغانستان ہندی مسلمانوں کی اعانت سے ہندوستان پر قبضہ کر لیگا۔ چنانچہ پنڈت مالوی نے گاندھی جی اور وائسرائے کے درمیان نامہ و پیام شروع کیا۔ اور گاندھی جی پر اثر ڈالتے رہے کہ وہ تحریک کو ختم کر دیں۔ انہی دنوں میں چورا چوری کے مقام پر پولیس کے ظلم و تشدد سے تنگ آکر عوام نے تھانے کو خود سپاہیوں سمیت جلا دیا۔

پنڈت مالوی موقعہ کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے گاندھی جی کو

آمادہ کر لیا کہ ترک موالات کی تحریک ختم کر دی جائے۔

گاندھی جی نے صدر کانگریس حکیم اجمل خاں سے بھی مشورہ نہ کیا صوبوں اور اضلاع کی کانگریس کمیٹیوں نے گاندھی جی پر بہت زور دیا۔ تحریک ترک موالات کے استوار سے ملک کی تحریک آزادی پر برا اثر پڑیگا۔ گاندھی جی نے پنڈت مالویہ کی تحریک پر اس کو ختم کرنیکا اعلان کر دیا جس پر علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا۔

کر چکے خدمت بہت کچھ کام کی
دیکھیے ہوتے ہیں کب سر مالوی

تحریک ترک موالات کے ختم ہونے کے بعد ہندوؤں کی جانب سے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شروع کی گئیں اور اسطرح ملک کی سیاسی فضا میں انتشار پیدا ہو گیا۔

گاندھی جی اور دوسرے رہنما خاموش ہو گئے مگر مولانا محمد علی نے رہا ہونے کے بعد اس دور میں بھی سچی بات کہنے میں تامل نہ کیا۔ ۱۹۲۷ء میں راجپال کی رسوائے عام کتاب پر مسلمانوں میں بڑا جوش وخروش پیدا ہو گیا جب دلیپ سنگھ جج پنجاب ہائی کورٹ نے راجپال کو رہا کر دیا جسٹس دلیپ سنگھ کے فیصلہ کے خلاف مسلمانوں میں نفرت وحقارت کے جذبات نمایاں ہو چکے تھے۔ انہوں نے جلسے منعقد کئے جلوس نکالے گرفتار ہوئے مولانا محمد علی نے اس نازک مرحلہ پر عوامی رائے سے اختلاف کیا مولانا محمد علی کی رائے تھی کہ جج کے خلاف ہنگامہ آرائی سود مند نہیں بلکہ کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ ایک ایسا قانون بنوایا جائے جس میں پیشوایان مذہب کی توہین کو جرم قرار دیا جائے۔ گاندھی جی اور اجمل خاں کی بھی یہی رائے تھی مگر مسلمان لاہور اپنے جوش وخروش میں اس رائے کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ جج کو برخاست کیا جائے۔ اس حالت میں مولانا محمد علی لاہور تشریف لائے

پہلے تو ٹیلیفون پر ان کو اطلاع دی گئی۔ کہ لاہور کے مسلمان آپ کی رائے کے خلاف ہیں
اس لئے بہتر ہو گا کہ اس موقعہ پر تشریف نہ لائیں انہوں نے کہا اس صورت میں تو میں
ضرور آؤنگا کیونکہ میں مخالف سے نہیں گھبراتا۔ اور چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کا ایجی ٹیشن
صحیح خطوط پر ہو چنانچہ وہ لاہور تشریف لائے لاہور میں ان کے بڑے حامی میاں فیروز
الدین احمد نے مجھے کہا کہ آپ مولانا کے ساتھ رہیں اور کوشش کریں کہ مولانا کی مخالفت
نہ ہو۔ نیز مسلمانوں میں اتحاد کی فضا پیدا کی جائے۔ چنانچہ میں مولانا کے ساتھ رہا لاہور
کے مسلمانوں کے رہنما مولانا ظفر علی خاں تھے اس لئے یہ کوشش ہوئی کہ مولانا محمد علی اور مولانا
ظفر علی خاں میں اتحاد و اشتراک ہو۔

میں اس سے پہلے مولانا ظفر علی خاں اور سید حبیب مرحوم ایڈیٹر سیاست
کے اختلافات دور کرنیکی سعی میں بھی شریک ہو چکا تھا۔ مگر مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی
خاں کی مصالحت کا معاملہ زیادہ پیچیدہ تھا۔

کیونکہ ایک تو دونوں کے نظریات میں کچھ اختلاف تھا دوسرے دونوں شخصیتیں
اپنے اپنے مقام پر بلند اور ممتاز تھیں۔ میں نے مولانا محمد علی سے گفتگو شروع کی اور
ایک وفد مولانا ظفر علی خاں کو لانے کیلئے بھیجا۔ مولانا محمد علی پہلے تو رضامند نہیں تھے
پھر اس شرط پر آمادہ مصالحت ہو گئے کہ جلسے میں ان کی مخالفت نہ کیجائے۔ اور آئندہ
زمیندار میں ان کے خلاف کچھ نہ لکھا جائے۔

اور ہم لوگ اس کے منتظر رہے کچھ دیر بعد مولانا ظفر علی خاں تشریف لے آئے۔
میں نے ان سے بھی یہی درخواست کی وہ نسبتاً سہولت سے اتحاد کیلئے آمادہ ہو گئے۔
مولانا محمد علی کو معلوم ہوا کہ احرار لیڈر جیل میں ہیں ان سے بھی ملاقات کی آرزو تھی پھر ہم
لاہور جیل گئے۔ جہاں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری چودھری افضل حق شیخ حسام الدین
اور غازی عبدالرحمن وغیرہ قید تھے۔

مولانا نے سب کو گلے لگایا مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرمایا آپ سے بہت گلے شکوے تھے۔ جب گلے سے لگ گئے سارا گلہ جاتا رہا۔

رات کو شاہی مسجد میں جلسہ ہوا۔ ہزاروں آدمی شریک ہوئے۔ مولانا محمد علی نے تقریر کی۔ کچھ آدمیوں نے شور مچایا۔ مگر مولانا ذرا نہ گھبرائے۔ اور انہوں نے درود پڑھنا شروع کر دیا۔ اس پر کچھ آدمی چلے گئے۔ بقیہ نے سکون کے ساتھ تقریر سنی۔ مولانا کے دلائل سنکر ان کے ہمنوا ہو گئے۔ مولانا کی تقریر کے بعد میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ مولانا کے دل و دماغ میں تمام خوبیاں جمع ہیں۔ ان کے پاس جارج (اسوقت کے برطانوی وزیر اعظم) کا دماغ اور کلیمنشو (اسوقت کے شیر دل فرانسیسی وزیر اعظم) کا دل ہے۔ ہمیں ان کی صحیح رہنمائی کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔

مولانا نے پیشوایانِ مذہب کی تکریم کیلئے مسودہ قانون بھی بنایا اور اسے منظور کرایا۔ اس کے بعد جب مولانا تشریف لائے تو میں ان کو نہ مل سکا۔ انہوں نے علامہ اقبال اور میاں فیروز الدین مرحوم سے شکایت کی کہ مولانا ظفر علی خاں معاہدہ پر قائم نہ رہے۔ اور پھر ان کے خلاف کچھ شذرات شائع ہوئے۔ اور میرا ذکر کیا کہ وہ معاہدہ میں شریک تھا (مولانا ظفر علی خاں کے علم کے بغیر زمیندار میں ایسی چیزیں چھپتی تھیں کیونکہ ادارہ زمیندار میں نظم و ضبط کی کمی تھی)

آخر میں مولانا سے ۱۹۲۹ء میں ملاقات ہوئی۔ اسوقت کانگریس کا اجلاس دریائے راوی کے کنارے منعقد ہوا۔ مجلس استقبالیہ میں شدید رسہ کشی ہوئی۔ آخر ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کی پارٹی غالب آئی۔ اسکا یہ اثر ہوا کہ ڈاکٹر ستیہ پال کے ساتھ ہونے کی وجہ سے مولانا ظفر علی خاں اور احرار نے اس جلسہ میں دلچسپی نہ لی۔ ڈاکٹر گوپی چند کی پارٹی نے غلبہ کی وجہ سے نمائندے بھی زیادہ تر ہندو بھیجے۔ اس لئے اجلاس میں مسلمانوں کی شرکت کم ہوئی۔ مولانا محمد علی (نہرو رپورٹ میں کلکتہ کانگریس میں ان کے

مطالبہ آزادی کے استرداد کیوجہ سے کانگریس سے الگ ہو گئے۔ وہ اس زمانے میں خلافت کانفرنس میں شرکت کیلئے آئے۔ خلافت کانفرنس زیادہ تر سید طیب کی مساعی سے کامیاب ہوئی۔ مولانا شوکت علی بے حد مسرور تھے کہ مولانا ظفر علی حال اور احرار کے گڑھ لاہور میں ان کو اجلاس کرنے کا موقعہ ملا۔ مولانا محمد علی کانگریس کی سیج دیکھنے کیلئے کانگریس کے پنڈال میں تشریف لے گئے۔ میں ان سے وہیں ملا۔ اور ان کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ اب نہرو رپورٹ ختم ہو چکی ہے۔ آپکا مطالبہ آزادی کانگریس نے تسلیم کرلیا ہے۔ اس لئے اب آپ پھر کانگریس سے رشتہ اختیار کریں۔ مولانا ہنس کر خاموش ہو گئے۔

مولانا محمد علی بڑی بلند شخصیت کے حامل تھے اور وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ ان کی وفات لندن میں ہوئی تو فلسطین کے عرب رہنماؤں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ محمد علی کو بیت المقدس کی سرزمین میں دفن کیا جائے۔

چنانچہ محمد علی کی نعش بذریعہ جہاز پورٹ سعید پہونچی تو حکومت مصر کی جانب سے وزیر اعظم اور علماء نے استقبال کیا۔ جب یہ جنازہ بیت المقدس پہونچا تو ہزاروں لوگ جمع تھے۔ قاہرہ علما اور طیونس کے عرب شعراء نے پر درد مرثیوں سے فضا کو معمور کیا۔ مصر کے شاعر احمد شوقی پاشا نے ایک بلند پایہ مرثیہ میں مولانا محمد علی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ یہ مرثیہ مولانا مرحوم کی تاریخی خدمات کا اجمالی تذکرہ ہے۔ مرثیہ ملاحظہ فرمائیں لے قدس تو اپنی قربت کے مہمان کیوجہ سے قابل مبارکباد ہے۔

آج تو اس کی ملاقات سے سرفراز ہو نبی نے اس لئے اپنے براق کے بیٹھنے کی جگہ کھول دی اور اس کے آنیکا مقام وہ ہے جہاں نبی رات کو گئے تھے۔ مشرق کیلئے حقوق کیلئے لڑنا اسکا کام تھا۔

مشرق کیلئے جو اس کی تڑپ تھی یا ہندوستان کے واقعات کیلئے اس کی بے خوابی سے عزیز ہندوستان بھلا نہیں سکتا فیل اپنی مصیبتوں میں اس کی آواز کو یاد کریگا۔ اور ترک اس کی سچی تڑپ کو فراموش نہیں کریں گے۔

اس نے زندگی میں وہاں کے باشندوں کی مدد اور اعانت کی پھر وہ وہاں کیلئے اجنبی کیسے ہو سکتا ہے۔

تین مضمون

حضرت مولانا احمد سعیدؒ کے حالاتِ زندگی

۱ مولانا احمد سعید کا قلمی چہرہ

۲ میری چشم اشک بار نے دیکھا

۳ مولانا احمد سعید بہ حیثیت قیدی کے

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صدر جمعیۃ علماء صوبہ دہلی و نائب صدر جمعیۃ علماء ہند پر حال ہی میں قاتلانہ حملہ ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ حملہ آور اپنے ناپاک ارادوں میں ناکام رہا۔ اور مولانا کے بازو پر خراش اور کولے پر ایک زخم آیا جسکو فوراً ہی ٹانکے لگا دیئے گئے اب مولانا رو ہیں۔

دہلی قدیم اب مٹتی جارہی ہے دہلی کی روایات آہستہ آہستہ اس کی زمین میں دفن ہوگئیں۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ دہلی کا ایک چراغ گل ہوا خواجہ حسن نظامی کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد اب حضرت بیخود دہلی اور حضرت مولانا احمد سعید دو ہی ہستیاں رہ گئی ہیں جن کے دم سے دہلی قدیم کی ایک جھلک سی باقی ہے۔ بیخود صاحب اب اتنے ضعیف ہوگئے ہیں کہ گھر سے! ہر آنے جانے یار رونق بزم بننے کے قابل نہیں رہے

حضرت مولانا احمد سعید ابھی حیات ہیں اور اپنی پوری کے ساتھ زندہ ہیں ان کی وضعداری ان کی محفلیں ان کے میل جول ان کی سیاست اور ان کے علمی اور مذہبی کاموں میں ابھی تک زندگی کی پرجوش لہریں ہیں۔ جنہوں نے ان کو ہمیشہ ہی دلی میں مقبول ومحبوب رکھا۔ مولانا کی عمر اب تقریباً ستر برس ہے۔ لیکن ان کی وضعداری اور رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور مولانا کی یہ مروت ہی ہے کہ وہ اس بڑھاپے میں بھی ہر تقریب اور ہر محفل میں ذرا سے بلاوے پر بے تکلف پہونچ جاتے تھے۔

مولانا کا بڑھاپا آپ کی حسین جوانی کی غمازی کرتا ہے۔ گورا رنگ قد بلند بالا جسم چوڑا چکلا، بڑی بڑی چمکدار سیاہ آنکھیں۔ جنمیں دلی کے حسن وجوانی کے بے شمار جھلکیاں پنہاں ہیں۔ اونچی ناک پیشانی پر علم وتہذیب کا ایک آفتاب روشن ہے۔ ترا شیدہ سفید داڑھی۔ جنپر کبھی کبھی پان کے سرخ قطرے شبنم کیطرح رقصاں نظر آتے ہیں۔ سر پر عربی رومال اس انداز میں بندھا ہوا جس کو دیکھ کر عرب مجاہدوں کی شان آنکھوں کو سامنے آجاتی ہے۔

کبھی کبھی چوغہ ورنہ کرتے پاجامے پر ایک ڈھیلی ڈھالی ایک صدری واسکٹ پہنے نظر آئیں گے۔ جوتے میں دیسی وضع کی پابندی نہیں دلی کے اس تاریخی کوچے میں رہتے ہیں جس کے ساتھ ہندوستان کی ایک تاریخ وابستہ ہے۔ اور جو برہا برس سے لیڈروں کا مسکن چلا آرہا ہے۔ اس کوچے میں مفتی کفایت اللہ مولانا محمد علی مرحوم اور آصف علی مرحوم رہتے تھے۔ خواجہ میر درد مرحوم اور حکیم اجمل خاں مرحوم رہتے تھے۔

اس کوچے کے در و دیوار آج یہاں سے گزرنے والوں سے نہایت حسرت بھرانداز میں پوچھا کرتے ہیں کہ مولانا کے بعد مولانا آج ان بزرگوں میں سے شاید گئے ہیں جنہوں نے اب سے چھتیس برس پہلے دہلی میں جمیعت علماء ہند کی بنیاد رکھی تھی مولانا مدتوں حضرت مفتی اعظم کے ہمراہ جو جمیعت علماء کے صدر تھے جمیعتہ کے ناظم اعلیٰ رہے ہیں اور اب ایک عرصہ سے نائب صدر چلے آتے ہیں کبھی زمانہ تھا کہ مولانا کی سیاست اتنی فعال تھی کہ مولانا کی نظریں ہندوستان کے مسلمانوں پر ہی نہیں عالم اسلام پر رہتی تھیں۔

دلی سے مراکش تک کسی جگہ کسی مسلمان کے پھانسی چیمبی اور مولانا نے یہاں سے وائسرائے اور وزیر ہند کو تار کھڑکاتے اور اس کی نقول اخبارات کو بھیجیں اور موقع ہوا تو ایک آدھ جلسہ بھی کر ڈالا اور اب تو مدت ہوگئی کہ تار گھر کے دروازہ پر مولانا کا کوئی آدمی تار لیکر نہیں پہونچا۔ اخبارات میں بھی بیان کو ترستے ہیں، شاید مولانا سمجھے ہیں کہ اب وزیر بھی اپنی سرکار بھی اپنے وائسرائے بھی اپنے ملک مخلص صدر جمہوریہ ہند بھی اپنے اب تاروں کی ضرورت ہے نہ بیانات کی۔

مولانا کی پوری زندگی سیاسی رہی لیکن مذہب کی تابع رہی ہے۔ کبھی

کوئی قدم ایسا نہیں اٹھا جسے اسلام کے منافی کہا جا سکے۔ اور جو قدم اٹھایا انہوں نے اپنے نزدیک یہی سمجھ کر اٹھایا کہ اس سے مسلمانوں کا بھلا ہوگا۔ تحریک خلافت سے لے کر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک متعدد بار جنگ آزادی میں جیل گئے ہیں۔ اور بہت سے نامور جیل خانوں کو آباد کیا ہے۔ میاں والی کا جیل خانہ مولانا کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔ جہاں مولانا نے چکی بھی چلائی ہے۔ اور بان بھی بٹے ہیں۔

مولانا خطیب بھی ہیں ادیب بھی ہیں عزیز بھی بہت عمدہ کرتے ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں ہے تقریر میں جملے کے جس حصے پر زور دینا چاہتے ہیں اس کو ساتھ ساتھ دہراتے جاتے ہیں۔ تقریر نہایت لچھے دار ہوتی ہے خواہ سیاسی ہو یا مذہبی مولانا مجمع کا دل موہ لیتے ہیں۔ ہم نے مولانا کو کئی کئی گھنٹے تقریر کرتے اور مجمع کو دم بخود بیٹھے دیکھا ہے۔ آخری یاد آپ کی گرفتاری اعظم گڈھ کی ایک تقریر کی بنا پر ہوئی جو زمانہ جنگ میں کی تھی۔ آپ نے اس تقریر میں ہٹلر کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

شامت اعمال ما صورت ہٹلر گرفت مولانا نے اسوقت تک کم و بیش بیس کتابیں لکھی ہیں اور ان دنوں آسان اور عام فہم تفسیر کا کتابی صورت میں سلسلہ جاری ہے۔

مولانا کے یہاں کی محفل بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ جو رات کو نو بجے کے بعد لگتی ہے۔ اور جس میں مولانا کے نورتن شریک ہوتے ہیں۔ اسوقت کوچہ چیلان سے لیکر کریملن اور وائٹ ہاؤس تک کی سیاست پر بحث ہوتی ہے۔ مولانا کی دوستی ہمیشہ ہی ہر طبقہ کے لوگوں سے رہی ہے ان کے دوست آج راشٹرپتی بھون پارک، روڈ لنگ، ایڈورڈ روڈ پر ہی نہیں رہتے بلکہ سوئی والان، پھوٹی والان، کوچہ استاد داغ، ٹیا محل، کلالی محل اور

پہاڑی املی پر بھی رہتے ہیں۔ اور ان میں جناب غوری پہلوان سے لیکر جواہر لال نہرو تک سب ہی لوگ شامل ہیں۔

مولانا نے ہندوستان کے دونوں محاذوں پر کام کیا ہے۔ پہلے جنگ آزادی کے سپاہی تھے اب تعمیر ملک کے رضا کار ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے آج تک آپکے مسلمانان ہند خصوصاً مسلمانانِ دہلی کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں مولانا کے یہاں آپ کسی وقت بھی چلے جائیں آپ کو کوئی نہ کوئی اپنا دکھڑا سناتا یا درخواست لئے نظر آئیگا۔

مولانا بڑے مہمان نواز اور متواضع واقع ہوئے ہیں مولانا کے یہاں ٹین کے بڑے بڑے ڈبوں میں ہمیشہ بہترین مٹھائی موجود رہتی ہے اور مولانا ہمیشہ دوستوں اور لحاظ پاس کے آدمیوں کی مٹھائی سے بہ اصرار تواضع کرتے ہیں۔ اور کہا کرتے ہیں بھئی یہ تو آپ کو کھانی ہی پڑے گی۔ آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے فساد میں مسلمانان دہلی کی انگلیوں پر گنے جانیوالے رہنماؤں نے خدمت کی اور جو حکومت ہند دہلی کے مسلمانوں اور گاندھی جی کے درمیان ایک کڑی بنے رہے ان میں حضرت مولانا قابل ذکر ہیں اور تاریخ میں اس کا خاص طور پر ذکر آئے گا۔

ختم شد

۲

بہ سلسلہ مضمون مولانا احمد سعید صاحب رح

میری چشم اشک بار نے دیکھا

۴ اور ۵ دسمبر کی درمیانی شب کتنی میں خلاف معمول شام کو کھانا کھا گھر سے نہیں نکلا اور یوں ہی کمر سیدھی کرنے کو لیٹا تھا کہ غنودگی طاری ہو گئی۔ کوئی سوا نو کا عمل ہو گا اور خوابوں کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ کہ کانوں نے محسوس کیا کہ کسی کا ٹیلی فون آیا ہے۔ اور بچی اس سے گفتگو کر رہی ہے۔ اور اسے کسی نے مالک قدار قند کے اس فیصلہ کی اطلاع دی جس کے خوف سے یہ ہر وقت لرزاں رہتا تھا۔ اس ہولناک خبر پر بچی گھبرا گئی اور اس کی گفتگو سے میری آنکھ بھی کھل گئی۔ اور پھر میں نے اپنے کانوں سے سنا کیا! الجمعیتہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر محمود قاری یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ بھئی کیا آپ کو علم نہیں کہ حضرت مولانا احمد سعید کا انتقال ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ہر وقت مجھ پر اسکا خوف طاری رہتا تھا لیکن میں اتنی جلدی یہ خبر نہ سننا چاہتا تھا۔ اور آج بھی میں کیسے یقین کر لوں کہ مولانا احمد سعید کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ ہنس مکھ چہرہ تو مجھے اسوقت بھی اسی طرح متبسم نظر آ رہا ہے مولانا اپنی سہ دری کے پہلے دروازہ کی چلمن کے عقب میں قالین پر ایک کروٹ سے ایک ٹانگ کھڑی کئے دوسری گاؤ کے سہارے اٹکائے لیٹے ہوئے ہیں۔ اور میرے کانوں میں آواز آ رہی ہے آؤ میاں نازش صاحب آؤ کہاں تھے۔ کئی دن میں آئے ہو۔ پھر میں اپنی آنکھوں اور کانوں کو کیسے جھٹلاؤں۔ کہ مولانا میری نظروں کے سامنے نہیں ہیں۔ اور ان کی آواز میرے کانوں میں نہیں آ رہی ہے۔ اور اگر فی الواقع یہ چیز صحیح ہے تو بھی میں جان بوجھ کر جھوٹ سمجھو اور دنیا بھر کو جھٹلانے کو تیار ہوں اس لئے کہ میرا دل نہیں مانتا کہ میں سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید کو مرحوم کہوں۔

قلم انحراف کرتا ہے اور کاغذ سے گردن اٹھا لیتا ہے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں اگر مرحوم مولانا احمد سعید نہیں لکھا جاتا۔ تاہم کب میں اب تک اپنے آپ کو فریب دیتا ہوں گا قرآن بانگ دہل اعلان کر رہا ہے۔ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْ

یہاں میرا خم ہوجاتا ہے۔ اور یہی تو وہ مقام ہے جہاں بڑے سے بڑا منکر خدا بھی اقرار خداوندی کرتا ہے۔

خبر صحیح تھی خبر دینے والا بھی معتبر تھا مگر پھر بھی میں بھاری مگر تیز قدموں سو یہ سوچتا ہوا حضرت مولانا احمد سعید صاحب کے دولت خانہ کی طرف جا رہا تھا کہ خدا کرے یہ خبر غلط ہو یا اگر واقعی موت کی بجلی خرمن احمد سعید پر گر چکی ہے تو بھی خداوند کریم تو مولانا کو ایک بار اور زندگی عطا کر کہ میں نے مولانا سے ان کی سوانح حیات قلم بند کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا میں اس کو تکمیل کر سکوں۔

مگر راستہ بھر پورے راستہ کی اداسی چھائے خالوں کی ویرانی لوگوں کی ٹکڑیوں کی کانا پھوسی اور جانے پہچانے چہروں پر چھائی ہوئی مردنی کہہ رہی تھی کہ مولانا اب اتنی دور جا چکے ہیں کہ جہاں سے وہ کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے وہ کبھی اس ادھوری کتاب کو مکمل نہ کر سکیں گے۔ اور ان کے سینے میں ہندوستان کی جو تاریخ دفن تھی وہ ان کے ساتھ ہزاروں من مٹی کے نیچے دب جائیگی۔

آہ آج ایک تاریخ مکمل ہوئی ہے مگر اسے پڑھ کر کوئی نہ کہے گا ایک دور ختم ہوا ہے جس کا حال اب کوئی نہ بیان کر سکے گا ایک نیا موڑ آیا ہے جہاں ہمیں اپنی منزل کے لئے ایک نیا راہبر تلاش کرنا ہوگا زندگی کا بہاؤ رک گیا ہے اب کوئی بڑے سے بڑا سیلاب اس ٹھیراؤ کو ختم نہ کر سکیگا۔

اور ہمیں اب خندہ پیشانی کے ساتھ اس فیصلہ کے آگے سر جھکا ہی دینا ہے پہنچے

خلد آرحمت عاشقان پاک را اور کوچہ ناہر خاں میں داخل

ہوتے ہی میری آنکھوں سے مشتاقان دیدہ کے اژدہام کو دیکھ کر یہ جان کر لیا ہے کہ وہ گیا ہے جو میں نہیں جانتا تھا اور چلا بھی گیا ہے۔

ہزار و خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے مگر یہ ایک خواہش تو ابھیا ندا ری

کے ساتھ ایسی تھی کہ اس پر دم نکلتا ہے اور ہزاروں بار نکل کر جب کبھی کبھی جان آشگی تو یہ خواہش اس کے ساتھ پیدا ہوگی مگر خوشی سے رنج کا بدلہ یہاں نہیں ملتا اور اب مجھے یہ غم کہ غم جاودان نہیں ملتا۔ ہرگز نہ رہے گا مولانا ٹھیک فرمایا کرتے تھے میاں سنا وہ فانی کیا کہتا ہے واہ کہتا ہے۔

زندگی کا ہے خواب دیوانے کا

ہر چہرہ حزن و ملال میں ڈوبا ہوا تھا

"جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی۔

میں بھی اس ہجوم غم میں ڈوب گیا مولانا کی رہائش گاہ کا دروازہ بند تھا اور دہلیزی دروازہ پر کھڑے تھے ہر شخص اس محبوب کے دیدار کے لئے بے چین تھا جوان کے ادنیٰ سے اشارے پر ان کے ساتھ ہو لیتا تھا معلوم ہوا کہ میت کو غسل دیا جارہا ہے۔ اور چونکہ اندر بھیڑ کافی ہو چکی تھی۔ اس لئے دروازہ کھلا اور باہر جو ہزار ڈیڑھ ہزار آدمی جمع ہوگئے تھے وہ گرتے پڑتے ایک دوسرے سے پہلے آگے بڑھ کر شربت دیدار نوش کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔

میں بھی اس ریلے میں اندر اسطرح جا پہونچا کہ جیسے سیلاب میں خس و خاشاک بہہ جایا کرتے ہیں مولانا کی میت سفید کفن میں ملبوس دروازے کے بالکل سامنے مشتاقان دید کی پیاس بجھانے کیلئے رکھ دی گئی تھی۔ تھوڑی جد و جہد کے بعد قطار قائم کر دی گئی اور لوگوں نے باری باری میت کو دیکھنے کیلئے پلنگ کے قریب سے گذرنا شروع کیا۔ ہر شخص ٹھنڈی سانس لیتا ہوا میت کے قریب سے گذرتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا اے موت۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہیں مرغ قبلہ نما آشیانے میں

مولانا کے چہرے پر ایک ملکوتی جلال و جمال تھا بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب کہنے ہی والے ہیں آؤ میاں ناظر صاحب آؤ تبسم لبوں پر کھیلنے ہی والا ہے۔ مردنی کے کوئی آثار نہ تھے کسی قسم کی بیماری کا کوئی اثر نہ تھا۔ مردنی نہیں تازگی اور شگفتگی تھی موت کی نیند نہیں آئی تھی بلکہ شاید قلب کی طویل علالت کے باعث تکان سے غنودگی طاری ہو گئی تھی۔ اور اب اٹھ کر پوچھنے ہی والے ہیں کہو پہلوان آج کیا خبر لائے ہو چندا بنانے کی بگر نہیں پہلوان کے چہرے کی پریشانی نمی سے جھکی ہوئی پلکیں تو کچھ اور ہی غمازی کر رہی تھیں۔ وہ دوسری طرف حمید کی آنکھیں حیرت سے پھٹی منہ کھلا خواجہ میر درد کی آواز سن رہی تھیں۔

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس !

تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

تمام صحن اور برآمدہ مشتاقانِ دید سے بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سب ہکابکا لب ایک دوسرے کو دیکھتے اور نظریں جھکا لیتے تھے۔ دسمبر کی اس خنک رات کو ٹھنڈی آہوں نے اور بھی سرد بنا دیا تھا۔ اتنا ہجوم ہونے کے باوجود خاموشی چھائی ہوئی تھی آسمان سے اداسی برس رہی تھی۔ در و دیوار سے حسرت ٹپک رہی تھی آہ

موت نے رات کے پردے میں کیا کیا مگر وطن کی ہے کہ ماتم کا

غبار معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار طنطنہ شیر کا باقی نہیں عوفی ہے کچھار۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کوچہ چیلان کا نہیں دلی کا وہ شیر موت کے پنجے کا شکار ہو گیا تھا جس نے برطانیہ کے روایتی شیر سے پنجہ لڑایا تھا۔ جو ساری عمر طوفانوں سے کھیلتا ہنگاموں کو سر کرتا اور معرکہ آرائیوں میں مصروف رہا تھا۔ لیکن آج وہ اپنی زندگی کے معرکے میں ہار گیا تھا۔ جو خود ہی شیر مٹی کا ایک ڈھیر ہو گیا تھا۔ اور اس کا کچھار سونا پڑا

تھا اور بقول شاعر اب یہ صورت تھی

جسم احمد سعید تھا فانی

نام احمد سعید ہے باقی

جس کمرے میں اسوقت مولانا احمد سعید کی محفل آراستہ ہوئی تھی اور کمرہ زعفران زار بنا ہوا تھا وہاں آج سوگواروں کی محفل تھی۔ سب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی رہ رہ کر مولانا کی موت کی تصدیق چاہتی اور اسے یہی جواب ملتا جی ہاں مولانا صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ دیکھئے حاجی سلیم ہیں جو آخری رسومات کی تیاریوں میں مصروف ہیں یہ پہلوان عوری ہیں جو پسینے پسینے ہو رہے ہیں جنہوں نے مولانا کی خاطر گھر بار کو تج دیا تھا۔ اور مدتوں سے رات کو مولانا کے پاس سوتے تھے۔ آج مولانا انہیں داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ پہلوان کو کبھی یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ یہ ساتھ یوں چھوٹ جائیگا۔ یہ حمید ہیں انہوں نے بھی اپنی راتیں مولانا کے نام بیع کر دی تھیں مگر آج یہ بھی موت کے دست تظلم کے شاکی کھڑے ہاتھ مل رہے ہیں۔ اور یہ مولانا حفظ الرحمٰن ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند ہیں جن کا تقریبًا بیس برس کا تو بہت ہی قریبی تعلق تھا اور آزادی کے بعد سے تو مسلمانانِ ہند کی کشتی کی دو پتواروں میں سے ایک وہ خود اور دوسری مولانا احمد سعید کے ہونے کے باعث ہمہ وقت کا ساتھ تھا دونوں ہر غمی و خوشی میں دوش بدوش نظر آتے تھے مگر موت نے ایک تیر ایسا سینہ پر مار کر پاٹے ہاتے۔ آج ہی شام کو سات بجکر دس منٹ پران کی گاڑی دہلی سے لیکر انہیں بہار کیلئے روانہ ہوئی اور دوسری طرف ملک الموت حضرت مولانا احمد سعید کی روح کو قفسِ عنصری سے لے کر روانہ ہوئے۔ دفتر جمعیۃ علماء میں مولانا کے انتقال کی خبر پہونچی تو اسٹیشن ماسٹر غازی آباد کو مطلع کیا گیا۔ اس نے گاڑی کے غازی آباد پہونچنے پر حضرت مولانا کو اس حادثہ جانکاہ کی اطلاع پہونچائی۔ اور بتایا کہ دہلی جانے

والی ایک گاڑی اسوقت تیار کھڑی ہے۔ آپ واپس جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ مولانا اپنی کتابیں پھیلا کر بیٹھ چکے تھے۔ وہ فوراً دلی لوٹ آئے تاکہ اپنے رفیق کار کو سپرد خاک کر سکیں۔

مولانا احمد سعید کے فرزند اکبر مولوی محمد سعید تعزیت کو آنیوالوں سے مل رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی بتایا کہ آج مولانا کی طبیعت کوئی خاص خراب نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے تمام معمولات پورے کئے جمعہ کی نماز پڑھی اور اس کے بعد ان کے مجلس بھی جمی عصر کی نماز حسب معمول محلہ کی مسجد میں با جماعت ادا کی اور پاخانہ تشریف لے گئے وہاں سے واپس آکر پلنگ پر بیٹھے۔ اور اخبار ہاتھ میں اٹھایا پھر ایک لڑکے سے جو اتفاق سے وہاں تنہا ہی تھا کہا کہ جا بے محمد سعید کو بلا کر لا میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ اور یہ سنتے ہی لڑکا بلانے چلے گیا اور مولانا بیٹھے بیٹھے پلنگ کے عرض میں لیٹ گئے۔ اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ آہ جب محمد سعید پہونچے اور حامد سعید پہونچے تو مولانا کی روح کارواں اتنی دور جا چکا تھا کہ

مولوی محمد سعید حافظ قرآن ہیں انہیں یہ حسرت رہ گئی کہ باوا کے آخری وقت میں ان کے سرہانے سورہ یٰسین نہ پڑھ سکے۔ حامد سعید صبح شام دوا کھلانے آتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے چمچوں سے نکال کر دیتے تھے ان کے دل میں یہ حسرت رہ گئی کہ وہ باپ کو آخری وقت میں شربت نہ پلا سکے اور یوں تو ایک باپ کی زندگی اولاد کے لئے ہمہ وقت ہدایت نامہ اور درس و عبرت کا نمونہ ہوتی ہے اور مولانا نے تو قدم قدم پر قرآن و حدیث کی روشنی میں اولاد کو تلقین کی ہے مگر اولاد ان سے آخری وقت میں کوئی وصیت و ہدایت نہ سن سکی۔ مگر کس قدر آسان موت ہوئی اور لبیا اللہ جیسی نہ نزع نہ جانکنی کی تکلیف نہ موت کے فرشتے نظر آئے نہ

کشمکش موت وحیات کا سامنا کرنا پڑا اور دروازہ کھولا اور دارا   سے دارالبقا میں داخل ہو گئے ۔ آہ سچ ہے

آنے جانے پہ سانس کے ہے مدار
سخت ناپائیدار ہے دنیا !

مولانا کا انتقال سات بجکر دس منٹ پر ہوا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر ساری دہلی میں اور پھر سوا نو بجے کی خبروں میں خبروں میں ساری دنیا میں نشر ہو گئی چنانچہ رات ہی کو وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو کا تعزیتی فون آیا اور انہوں نے مولوی محمد سعید صاحب سے اظہار تعزیت کیا ۔ اس کے بعد دوسری دفعہ پھر وزیر اعظم کی کوٹھی سے اطلاع دی گئی کہ صبح کو پنڈت نہرو خود مولانا کے دیدار کے لئے تشریف لائیں گے ۔ اور اس کے بعد پورے دلی ایڈمنسٹریشن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی ۔ اب آئی جی کے یہاں سے فون آرہا ہے اب ڈی ۔ سی کے یہاں سے فون کی گھنٹی بج رہی ہے ۔ اور اب کوتوالی والے فون کر رہے ہیں اور پھر ڈی آئی جی ایس پی اور نہ جانے کون کون پولیس اور سی آئی ڈی کے افسران رات کے بارہ بجے تک مولانا کے مکان پر آتے اور جاتے وقوع کو ملاحظہ کرتے رہے ۔ تاکہ وزیر اعظم کی سکیورٹی و تحفظ کے انتظامات کر سکیں ۔

رات کو ڈیڑھ بجے تک مشتاقانِ دید کا ہجوم رہا اور اس وقت بمشکل لوگوں سے مکان یہ کہہ کر خالی کرایا گیا کہ عزیز اور رشتہ دار خواتین پھر صبح کو مولانا کے دیدار کو نہ آسکیں گی اس لئے فی الحال ان کے لئے مکان کو خالی کر دیا جائے اور صبح کے پانچ بجے تک پردہ رہے چنانچہ ایسا ہی ہوا رات بھر خواتین میت کے پاس اور مرد باہر ایک بیٹھک میں قرآن خوانی کرتے رہے ۔ اور صبح کی نماز کے بعد مشتاقانِ دید جوق در جوق ایک ایک دو دو چار چار اور چھ چھ کی صورت میں آتے رہے رات ہی میں دروازہ

سے لیکر گلی کے باہر تک بانس باندھ کر راستے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ تاکہ دیکھنے والوں کا ہجوم کنٹرول کیا جا سکے۔ ایک راستے سے وہ قطار بنا کر آئیں اور دوسری طرف سے دیکھ کر چلے جائیں۔

مولانا کا آخری دیدار کرنے والے اندھیرے سے آنے شروع ہو گئے تھے۔ اور جوں جوں روشنی پھیلتی گئی توں توں آنیوالوں کا ہجوم بھی بڑھتا گیا۔ اور سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے سے پہلے نہ صرف مولانا کا یہ مردانہ مکان جیس میں مولانا نے زندگی کے آخری دنوں کو پورے کئے سوگواروں سے بھر چکا تھا بلکہ باہر گلی میں ایک لمبی قطار اپنی باری کی منتظر تھی۔ مولانا کی میت صحن میں دروازے کے بالکل سامنے رکھی ہوئی تھی۔ صحن کے اوپر شاہی شامیانہ بندھا ہوا تھا میت گلاب کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی سرہانے آس پاس ہر طرف عود عنبر کی خوشبو اور اگر بتیوں کا دھواں رنج و غم کی فضا کو گہرا بنا رہا تھا آنے والوں میں عورتیں مرد بچے اور بوڑھے سبھی شامل تھے اور ہر طبقے و خیال اور ہر مذہب وعقائد کے لوگ تھے عورتوں میں کوئی بوڑھی تھی کوئی بیوہ تھی کوئی جوان تھی کوئی ہندو تھی تو کوئی سکھ اور کوئی مسلمان کوئی سسکیاں بھرتی ہوئی لاش کو دیکھتی گذر گئی کوئی آنسوؤں سے منہ دھوتی گذری تو کوئی منہ پونچھ رہی تھی کوئی زار و قطار رو رہی تھی ایک عمر رسیدہ عورت نے ٹھنڈی آہ بھری۔

اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

ایک جہاں دیدہ عمر رسیدہ مرد کو داڑھی آنسوؤں میں تر کئے کھڑے ہو کر یہ کہتے ہوئے سنا گیا، دنیا کا حال اہل عدم ہے۔ یہ مختصر اور واقعہ یہ ہے کہ اس مختصر سی زندگی میں انسان بڑے بڑے غرور و گھمنڈ کے مظاہرے کرتا ہے۔ مگر کچھ خاصان خدا ایسے بھی ہوتے ہیں جو خدا کے بندوں کی خدمت اپنی زندگی کا نصب العین

جان لیتے ہیں ان کا ہر سانس بنی نوع انسان کی خدمت میں گذرتا ہے۔ وہ شہیدوں کی موت مرتے ہیں اور پلک جھپکتے ہی ملک عدم کو ہو لیتے ہیں موت ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوئی جھجکتی ہے۔ اور دنیا دھاڑیں مار مار کر ان کو روتی ہے اور دل تھام کر یہ کہتی ہے

چارہ دل سوائے صبر نہیں

صبح سات بجے کے قریب مکان کے چاروں طرف چھتوں پر ہر چپہ پر ایک آدمی چمکنے لگا۔ یہ پنڈت نہرو کے آنے کیلئے انتظامات تھے۔ شب میں اور پھر صبح کو جن نمایاں لوگوں نے مولانا کے آخری دیدار کئے ان میں وزیر تعلیم لاہور، پروفیسر ہمایوں کبیر، شریمتی جوشی ممبر پارلیمنٹ دار العلوم دیوبند سے حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی ایڈیٹر پیام مشرق حافظ محمد یوسف صاحب مالک وزیر دلی کارپوریشن کے کمشنر مسٹر ناتھ حافظ محمد ابراہیم صاحب نو بجے بمشکل آئیوالوں کو روک کر پنڈت نہرو کے آنے کیلئے انتظام کیا گیا۔ اور نو بجکر بیس منٹ پر پنڈت جی جنگ آزادی کے اس بوڑھے جرنیل کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے پہونچے کتھئی رنگ کی شیروانی چوڑی دار پاجامہ سر پر کھدر کی گاندھی کیپ چہرہ پر انتہائی حزن وملال کے آثار آنکھیں سرخ جیسے ابھی ابھی غم کی گھٹائیں برس کر تھمی ہوں تھی۔ ہونٹوں پر خشکی ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے میت تک پہونچے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور حاجی محمد صالح میت کے پہلو میں کھڑے تھے ان کے پاس آکر ٹھہر گئے کچھ دیر ٹکٹکی باندھے دم بخود آخری دیدار میں محو رہے پھر مولانا حفظ الرحمٰن سے مخاطب ہوئے، بولے چہرے پر اس وقت بھی تبسم ہے موت کے آثار بالکل ہی نہیں حاجی صالح درمیان میں ہی بول اٹھے دلیوں کی

موت ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ موت کا یونہی خندہ پیشانی سے استقبال کیا کرتے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے بتایا کہ کس آسانی سے اور آناً فاناً موت واقع ہوئی ہے۔ اور پنڈت نہرو پھر پلٹے ان کی نظریں پھر مولانا کے چہرے پر گر گئیں۔ چند لمحے بعد نظر اٹھی تو مولوی محمد سعید صاحب میونسپل کونسلر پر پڑی انہوں نے فوراً سوال کیا اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے بتایا کہ یہ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولوی محمد سعید ہیں اس کے بعد انہوں نے پھر پوچھا اور کتنے بچے ہیں مولانا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جواب دیا چار لڑکے چار لڑکیاں اس کے بعد پنڈت جی نے ایک نظر دوبارہ مولانا احمد سعید صاحب پر ڈالی اور پھر واپس چلے گئے۔

پنڈت جی کی آمد کی وجہ سے باہر میت کا دیدار کرنے والوں کی ایک بہت بڑی لائن لگ گئی۔ ایک بار پھر ان لوگوں کے دیدار کرنے کیلئے انتظام کیا گیا۔

گیارہ بجے کلمہ کی بلند آوازوں میں جنازہ اٹھا اور پھولوں کی بارش میں میت کو مرحوم آصف علی بیرسٹر کے مکان کے سامنے لائے جہاں اسے ایک ایسے پلنگ پر رکھا گیا جسمیں لمبے لمبے بانس اس لئے باندھ دیئے گئے تھے کہ جنازہ کو کندھا دینے میں سہولت ہو اور ہر شخص کندھا دے سکے۔ اب یہاں سے جنازہ ایک زبردست ہجوم کے ہاتھوں میں جسمیں کہ ہر شخص کندھا دینے کو بے چین تھا۔ تراہا بیرم خاں کی طرف روانہ ہوا وہاں سے گذرتا ہوا جامع مسجد آیا۔ جنازہ کے جلوس میں مولانا حفظ الرحمٰن ممبر پارلیمنٹ مسٹر مقیم الدین فاروقی جنرل سکریٹری دلی کمیونسٹ پارٹی اور مختلف جماعتوں کے رہنما اور سیاسی کارکنوں کا ایک تھا جو جنازہ کو کندھوں پر اٹھائے بڑھ رہا تھا۔

اس علاقہ میں مکمل ہڑتال تھی ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں سب ہی کی دکانیں بند تھیں۔ اور جنازہ میں بھی ہر فرقے کے لوگ شامل تھے۔ جن جن راستوں سے جنازہ

کا جلوس گذر رہا تھا وہاں بازاروں میں سوگواروں کا ہجوم تھا چھتوں برآمدوں اور دریچوں سے خواتین اپنے مرحوم رہنما کے آخری دیدار کیلئے گھنٹوں سے منتظر تھیں۔ اس لئے کہ مولانا سب ہی کے دوست تھے سبھی کے ہمدرد و غمخوار تھے۔ سبھی کے کام آتے تھے ان کی محفل میں ایک مہتر بہشتی کباڑیہ دھوبی ٹھیٹھرا کنجڑا تیلی شاعر ادیب صحافی لیڈر اور وزیر غرضیکہ ہر شخص بلا تکلف باریابی پاسکتا تھا۔ اس لئے ان کے سوگواروں میں سبھی تھے ہر شخص اپنی اپنی کہہ رہا تھا کہ اب دلی والوں کا کام کون کریگا۔

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں

اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں

ایک کہہ رہا تھا میں جب کبھی بھی پاسپورٹ بنوانے کیلئے مولوی صاحب کے پاس گیا انھوں نے فوراً ہی پاسپورٹ آفیسر کے نام خط لکھ کر دیا۔ دوسرے نے کہا میاں تھانے چوکی کا معاملہ آن پڑتا تو مولانا صاحب گھر بیٹھے بیٹھے ہی ٹیلیفون پر مشکل آسان کر دیتے تھے۔

تیسرے نے یوں خراج عقیدت پیش کیا میاں ہی کے دم سے دم تھا اور بس اب تو اللہ ہی اللہ ہے۔

ایک دوکان کے پھٹے پر کھڑی ایک عورت بیوہ زار وقطار رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اب لحاف کون بنوا کر دیگا۔

صبح کو جنازہ روانہ ہونے سے قبل جمنا بازار سے ایک شرنارتھی عورت اپنی لڑکی کے ساتھ گھر تک پہنچ کر بڑی مایوس ہوئی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ مولانا کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ وہاں ایک لکڑی کے کھوکے میں رہتی ہے اور کارپوریشن والے اسے اٹھا رہے ہیں اسکو کسی سے پتہ چلا تھا کہ کارپوریشن کے کمشنر مسٹر نانک مولانا کی بات بہت مانتے ہیں اس لئے وہ نانک صاحب کے نام خط لکھوانے آئی

تھی ۔

ایک گرخندار نے کہا میں تو جانتا تھا کہ ایک دن مولوی کا ہارٹ فیل ہوگا بہت دوائیں پلائیں بیٹوں نے بہت تدبیریں کیں ۔ پردہ شعر کو غالب نے کہا ہے نا الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ۔ دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا۔ اور جب شاعروں کے مرکز اردو بازار کے سامنے دلی کے آخری زبان داں کا جنازہ آیا تو حالی کا مرثیہ میرے ذہن میں اسطرح ابھرنے لگا جیسے حالی مرحوم مولانا کے جنازے پر مرثیہ پڑھ رہے ہوں ۔ تھا زمانے میں ایک رنگین طبع

رخصت موسم بہار ہے آج

تھی ہر ایک بات پشتر جس کی

اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

دل میں مدت سے تھی خلش جس کی

وہی برچھی جگر کے پار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دل ناشاد

کس سے خالی ہوا جہاں آباد

ایک اور شاعر کی زبان میں کسی نے یوں خراج عقیدت پیش کیا۔

زندگی تیری بہار چمنستان وفا آپ ترے لئے قوم سے پیمان وفا

مرد میدان وفا جسم وفا جان وفا

ہو گئی نذر ہستی فانی تیری

نہ تو پیری رہا تیری نہ جوانی تیری

اوج ہمت پہ رہا تیری وفا کا خورشید

موت کے خوف پہ غالب ہے خدمت کی امید

بن گیا قید کا فرمان بھی دا جبیت کی امید

ہوتے تاریکی زنداں میں تیرے بال سپید

پھر رہا ہے میری نظروں میں سراپا تیرا

جامع مسجد شاہجہانی کے سامنے سے جنازہ گذرتے ہوئے مجھے مولانا کی وہ تقریر جو انہوں نے گذشتہ سال شعبان کی پندرھویں شب کے اجتماع مبارک سے خطاب فرماتے ہوئے کی تھی انہوں نے کے اس شعر سے تقریر کا آغاز کیا تھا۔

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب

موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

اور پھر فرمایا کہ میں تو صرف اس لئے آگیا ہوں کہ خدا جانے اگلے سال مجھے اس بابرکت رات میں یہ سعادت حاصل ہو یا نہ ہو۔ اس لئے میں حاضر ہو گیا ہوں مولانا نے بالکل صحیح محسوس کیا تھا اور آج

کاندھے پہ لئے سمت اہل جنوں بسمل کا جنازہ جاتے ہیں۔ یعنی مولانا احمد سعید کا جنازہ اسی جامع شاہجہانی کے سامنے سے گذر رہا تھا جس کے منبر پر انہوں نے، گذشتہ دس گیارہ برس میں، اس سے پہلے کبھی نہیں فرمائی تھی۔ آج ان الفاظ پر غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ مولانا نے اس سال پہلے یہ بات اس انداز میں کیوں فرمائی غالباً وہ اب اپنی زندگی کا پیمانہ لبریز دیکھ رہے تھے۔ انہیں اب موت بالکل سامنے کھڑی نظر آتی تھی۔ اور آج جامع شاہجہانی کے مینارے حسرت و یاس کے عالم میں کھڑے یہ دلدوز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ایک نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کم و بیش پچاس برس تک اس مسجد کے منبر سے امت محمدیہ سے خطاب کرتا رہا ہے واصل بحق ہو چکا ہے۔ اور احباب کے دوش پر سوار سوئے خلد بریں جارہا تھا۔

ختم شد

(۳۰)

بہ سلسلہ مضمون مولانا احمد سعید صاحبؒ

مولانا احمد سعید بحیثیت قیدی

کے

میرے لئے یہ نئی بات ہے کہ میں کسی بزرگ ہستی کے محاسن بیان کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ دوسرے زبان و قلم سے بھی میری مشیت بہت کمتر ہے جو مولانا احمد سعید مرحوم کی سی بلند شخصیت کو حاصل تھی ہندوستان کا یہ بلند پایا مقرر عالم دین قوم پرست اور قید و بند کی مصیبتوں کا عادی ایک طرف اور دوسری طرف مجھ جیسا بے مایہ انسان جو ہر لحاظ سے کمتر درجہ رکھتا ہو وہ مولانا احمد سعید کے متعلق کچھ لکھے بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ ہاں اگر یہ تحریر کسی محدود مجلس کے لئے ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا اب جبکہ کسی دوست کی خواہش پر یہ مضمون سپرد قلم کر رہا ہوں تو سوچتا ہوں کہ مولانا احمد سعید مرحوم کے بارے میں کونسی بات بیان کروں۔ جس پر مجھ کو قدرت حاصل ہے۔ اور جس کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔

میں نہ عالم دین ہوں نہ صاحب فکر سیاستداں نہ مقرر اور نہ کوئی اور بات مجھ میں ایسی ہے جو مجھے یہ جرأت دلائے کہ میں کچھ لکھ سکوں جب یہ خیال دل میں آتا ہے اور میں غور کرتا ہوں کہ میں نے حضرت مولانا احمد سعید کو ایک ایسی جگہ قریب سے دیکھا ہے جہاں پہونچکر ہر آدمی اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہتا۔ اور جو اثر وہاں میں نے ان سے لیا ہے ان کے بیان کرنے پر مجھے کسقدر قدرت حاصل ہے اس لئے میں سوچتا ہوں کہ اگر وہی بیان کرسکوں تو بہتر ہوگا۔ اور اس بیان پر کسی کو کم از کم حرف گیری کا موقعہ نہ ملیگا۔

ورنہ ایک اخبار میں مضمون کا شائع ہونا بڑا اہم سوال ہے۔ اور پھر وہ مضمون ایک ایسی ہستی کے بارے میں ہو جس کے لئے میرے دل میں غائبانہ عقیدت ہے۔

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے   آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کیلئے

میں حضرت مولانا احمد سعید مرحوم کی جیل خانہ کی رفاقت کا ذکر چند الفاظ میں

سپرد قلم کرونگا اس سے شاید ان حضرات کو کچھ فائدہ حاصل ہو سکے جو ان سے عقیدت
و شناسائی رکھتے ہیں۔ اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو اتنا تو ضرور ہو گا کہ میری یاد ان کے نام کے
ساتھ منسلک ہو جائے گی۔ پھر میری موت کے ساتھ بھی شاید مولانا کی یاد کا سلسلہ کچھ
عرصہ قائم رہ جائے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہم مرنے والوں کی یاد پر تاثیر الفاظ میں بیان
کرتے ہیں اور ان کمینوں کو بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں جو ہماری نظر میں مرحوم
کی یاد کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ مگر میں آج صدق دل سے اپنی کوتاہیوں کو تسلیم
کرنے کیلئے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ میں حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ میانوالی جیل میں رہا
ہوں میری سیاسی زندگی کی بنیاد ہی میانوالی کا جیل خانہ بنی ہے مجھے خوب یاد ہے
کہ میں کیا تھا اور ۱۹۲۱ء کی قید نے مجھے کیا بنا دیا۔

میانوالی کا جیل خانہ

۲۵ والنٹیروں کا ایک دستہ امرتسر سے سول نافرمانی کے جرم میں سزایاب
ہو کر جنوری ۱۹۲۲ء کی آخری تاریخوں میں میانوالی جیل میں رات کے وقت پہونچا
میری عمر اس وقت ۱۸ سال کی تھی میں زمانے کے نشیب و فراز سے بے خبر نوجوان جس کو زمانہ
کی عام تعلیم سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ اور نوجوانوں کی عام زندگی سے بھی کوئی لگاؤ
نہ تھا پہلی بار قید ہو کر پنجاب کے اس دور دراز ضلع میں پہونچا۔

صبح ہوئی تو جیل کی دیواروں پر نظر پڑی ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ کوئی دوسرا قیدی
جو سیاسی جرم میں سزایاب ہوا اس جیل میں ہے۔

ہماری بارک کی دیوار کے دوسری طرف سے ایک آواز آئی کہ بھئی [illegible] کو سنو سنو
دیکھا تو ایک قیدی جیل کا کمبل اوڑھے ہوئے اور لباس سے [illegible] جس کی سفید
داڑھی سرخ و سفید رنگ کرنجی آنکھیں آواز میں کرارا پن [illegible] کہ بیٹو گھبراؤ نہیں [illegible]

حلوہ کھلاؤ اور گا حلوہ ذرا صبر کرو۔ معلوم ہوا کہ یہ مولانا عبداللہ دہلوی آنے والے ہیں۔ ہم لوگ بھی کھڑکیوں پر چڑھ کر دیکھنے لگے تو کئی ایک قیدی جو جیل کی میں تھے نظر آئے ہم لوگوں نے ابھی جیل کے کپڑے نہیں پہنے تھے۔

مولانا نے چلا کر کہا دیکھو یہ مولانا احمد سعید دہلوی ہیں مولانا کا لباس بھی وہی تھا ایک کمبل اوڑھے ہوئے اور خاموش نظر آرہے تھے۔ اس سے بیشتر کچھ عرصہ پہلے میں امرتسر کے ایک تعلیمی جلسہ میں مولانا کی تقریر سن چکا تھا اور پھر ان کا نام بھی تمام ہندوستان میں بطور ناظم جمعیتہ علما مشہور تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ مولانا احمد سعید جیسا بلند پایا عالم بھی اس جیل میں موجود ہے۔ دوپہر کے بعد سب کے لئے دروازہ کھلا کہ دیکھیں حالانکہ جیل والوں نے کسی دوسری ضرورت کے ماتحت ایسا کیا تھا لیکن اسوقت میری دلچسپی کا مرکز مولانا احمد سعید تھے۔ دیکھا کہ ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے بان کی رسی بٹ رہے تھے۔ ہاتھ زخمی تھے اور سردی اور تیز ہوا چل رہی تھی جسم کو کمبل سے چھپا رہے تھے میں نے قریب پہونچکر سلام عرض کیا متبسم ہونٹوں کے ساتھ جواب دیا وعلیکم السلام اور پھر بنا کچھ دریافت کئے چند کلمات میں ہمارے ساتھی والنٹیروں کی جو اسوقت وہاں موجود تھے حوصلہ افزائی فرمائی اور کہا بیٹا دیکھو میں بوڑھا یہاں بہت مزے میں ہوں۔ تم نوجوان ہو بات ہی کیا ہے ہفتہ کے بعد ہی تو ہم لوگ قید گذار کر رہا ہونیوالے ہیں اور ابھی تو کئی بار آنا ہوگا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ انتہائی تشنگی کی حالت میں ٹھنڈا پانی مل گیا ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا احمد سعید کو انتہائی تکلیف ہے کہ کافی عرصہ سے پان نہیں ملا اور دانتوں میں جیل کے کھانے کی وجہ سے سوزش پیدا ہو گئی ہے۔ ہاتھ زخمی ہیں مگر جیل کا کام پورا کرتے ہیں پورے آٹھ چھٹانک رسی تیار کرتے ہیں پھر سب سے مشکل کام اس رسی کا

صاف کرنا تھا جو بٹنے سے بھی مشکل تھا مولانا وہ بھی کرتے اور اسی میں ان کا سارا دن کٹتا تھا۔

چند دن کے بعد قیدیوں میں امتیاز قائم کیا گیا کیونکہ اس زمانے کا جیل خانہ دوزخ سے بھی بدتر ہوتا تھا۔ اول لباس میں صرف ایک جوڑا تھا ایک کرتہ جو کولہوں تک کھلا بغیر آستین کے ہوتا تھا اور صرف ناف تک لمبا ہوتا تھا اس سے نیچے کے حصے کیلئے ایک ایسا لباس تھا جس کو اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ لنگوٹ سے کچھ زیادہ بڑا تھا گلے میں لوہے کی تار کے ساتھ ایک لٹکتا ہوا لکڑی کا ٹکڑا ہوتا تھا جسکو قیدی کی نشانی کہا جاتا ہے۔ جسمیں جرم اور قید کندہ ہوتی تھی۔ سر پر ایک ایسی ٹوپی جو خواہ مخواہ شکل بگاڑ دے۔ یہ ایک ہی جوڑا ہر قیدی کو ملتا تھا۔ اس کے سوائے کچھ نہ تھا نہانے کیلئے مشکل سونے کیلئے تکلیف۔ کپڑا تبدیل کرنے کیلئے کچھ نہیں کپڑا دھونے میں دقت صابن کا سوال مشکل تر اور دھونے کا ایسا انوکھا طریقہ تھا جس کو ہر قیدی کر نہیں سکتا تھا اگر اپنے کپڑے بھٹی میں ڈالدیئے تو پہننے کیلئے کچھ نہیں۔

دوسرے قیدی کچھ نہ کچھ کر لیتے تھے مگر ایسی قیدی کیلئے انتہائی مشکل تھی ایسی حالت میں سب سے زیادہ تکلیف رفع حاجت کے سلسلہ میں پیش آئی تھی سب سے زیادہ تھی پانی لیجا نہیں سکتے" اور سب کے ساتھ قطار میں بیٹھنا اور بالکل بے پردہ ہونا ضروری تھا یہ تھی اس جیل خانے کی حالت جس سے حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو پہلے پہل پالا پڑا۔ اور مولانا نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ وہاں کا وقت گذرا جیل کی زندگی کے ضمن میں اگر اس زمانے کی خوراک کا ذکر میں نہیں کرتا تو بات ادھوری رہ جائے گی پنجاب کے جیل خانہ کا کھانا ہر قیدی کیلئے یہ تھا صبح کے وقت خشک چنا اور دوپہر کو دو روٹی اور

ایک سبزی رات اور دو روٹی اور دال، ان دو روٹیوں کی بات بھی سن لیجئے۔ کہ یہ دو روٹیاں ساڑھے سات چھٹانک وزن کی ہوتی تھیں۔ جمیں پانچ چھٹانک آٹا اور باقی ڈھائی چھٹانک پانی یہ تو قانون کے مطابق تھا درحقیقت یہ روٹی آدھی کچی ہوتی جسے کھانے کیلئے دانتوں کا زور لگانے کی ضرورت نہیں کھانا مشکل تھا اور پھر اگر دونوں ہاتھ بڑھا کر آپ روٹی نہ لیں تو وہ آدھی ادھر آدھی ادھر گر جاتی جیسا کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری کے ساتھ ہوا اب اس کا کیا بیان کروں اور وہ کچی سبزی جانوروں کے سامنے ڈالی جاتی تو وہ بھی اس کو قبول نہ کرتے۔ اس پر طرہ یہ کہ صفائی نام کو نہیں ہوتی تھی۔

شام کو کھانے کے ساتھ ایک دال آتی تھی جس کا ہمیشہ ایک ہی رنگ ہوتا تھا اور وہ رنگ سیاہ تھا لوہے کی بالٹی میں ڈالنے کے بعد وہ اور بھی سیاہی مائل ہو جاتی تھی مگر اس دال کا نام میں آج تک نہیں جانتا کیونکہ اس میں دال کا دانہ میں نے کبھی نہیں پایا تلاش کیا مگر مجھے کبھی نہیں ملا۔

ایک دلچسپ واقعہ

دال کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ ایک بار مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری نے یہ ناکام کوشش کی کہ دال کا پانی گرا کر نیچے سے جو دال نکلے اس سے وہ روٹیاں کھالیں مگر سارے کا سارا پانی گرانے کے بعد انہوں نے دیکھا تو برتن میں کچھ بھی نہ بچا تھا اب اور دال تو مل نہ سکتی تھی کیونکہ وہ لوگ جا چکے تھے اور کوٹھریاں میں بند ہونے کا وقت قریب تھا ایسی حالت میں کو لئے صاحب۔۔۔ یہ خیال نہ کریں کہ وہ کوئی دوسری چیز بھی مل سکتی تھی وہاں تو پیاز نمک مرچ وغیرہ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ اگر کسی کے پاس مل جاتے تو یہ جیل میں

جرم تھا اور اسکی سخت سزا تھی۔

یہ سارا نقشہ میں نے اس لئے بیان کیا کہ خوراک اور لباس جو اس زمانے کے جیل خانے میں ملتا تھا اس سے دلی کے اس بلند پایا عالم کو دوچار ہونا پڑا۔ مگر ہم نے کبھی ان کی زبان پر حرف شکایت نہیں دیکھا۔ ان کے ساتھ ان کے دلی کے دوسرے رفقار کار بھی تھے ایک تو ان کے ہم مقدمہ مسٹر عبدالعزیز انصاری تھے باقی لالہ شنکر لال دہلوی مولوی بقا اللہ عثمانی پانی پتی صوفی اقبال احمد انصاری وغیرہ تھے۔

کمرے کی تبدیلی

جب کمرے کی تبدیلی ہوئی تو ایک کمرے میں مندرجہ ذیل حضرات تبدیل کر دیئے گئے جن میں ایک ماہ بعد مجھے بھی منتقل کیا گیا۔ یہی وہ مجلس تھی جس کا تذکرہ میں نے ابتدائی مضمون میں ماتمی پیرائے میں کیا ہے۔

مولانا احمد سعید مرحوم۔ عبدالعزیز انصاری۔ مولانا داؤد غزنوی۔ مولانا بقاء اللہ پانی پتی۔ عبدالماجد سالک۔ اختر علی خان۔ راجہ غلام قادر خاں۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ یہ اصحاب اس جیل میں تھے۔ اور جو کبھی کبھار آتے رہتے تھے۔ ان میں مولانا عبداللہ دہلوی آنیوالے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی وغیرہ بھی تھے۔ جن سے اکثر مجلسیں رہتی تھیں اور ان تمام مجالس کا مرکز مولانا احمد سعید ہی تھے۔

محض کمرہ

میانوالی جیل میں ایک بارک محض کمرہ کے نام سے موسوم تھی جس میں

مولانا احمد سعید اور ان کے باقی رفقاء کو منتقل کیا گیا تھا۔ اس کمرے کو ان حضرات کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل تھی حتیٰ کے جیل خانہ کے افسران بھی ان حضرات کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ حضرت مولانا احمد سعید کی بزلہ سنجی اور لطیفہ گوئی اپنے رفقا کی تفریح طبع کیلئے اکثر دلچسپی کا باعث بن جایا کرتی تھی۔ اور وہ بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ جیل کا وقت اچھی طرح گذارنے کیلئے ہنستے کھیلتے رہنا ۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ یہ جیل کی زندگی تب ہی ٹھیک گذر سکتی ہے۔ کہ ساتھیوں کیلئے کچھ مشغولیت اور کچھ تفریح کیلئے کرتے رہیں ورنہ اور کچھ نہیں تو ہم جیل والوں سے ٹکر لینے کی سوچتے رہیں گے۔ جیسا کہ میانوالی جیل میں اکثر ہوا۔ یہاں تک کہ جیل والوں نے قیدیوں پر لاٹھی تک بھی چلائی مگر مولانا کی مداخلت اکثر بچاؤ کا باعث ہوئی۔

ایک بار مولانا احمد سعید نے چوہا مار کر ڈوری میں باندھ کر دروازہ میں لٹکا دیا جب جیلر آیا۔ تو مولانا نے ازراہ مذاق کہا جیلر صاحب یہ دیکھئے میں نے چوہا مارا ہے فرمایئے کتنے دن کی معافی ملیگی جیلر نے کہا آپ تو عدم تشدد کے حامی ہیں۔ آپنے تشدد کیوں کیا۔ مولانا کا یہ برجستہ جواب تھا۔ کہ صاحب یہ کونسا سرکاری ملازم تھا۔ جیلر صاحب مسکرا کر چلے گئے۔

جب گرمی کی شدت زیادہ ہوگئی۔ تو اتفاق سے مولانا احمد سعید صاحب کو تمام کھانے وغیرہ کی ذمہ داری سب کی طرف سے خود سنبھالنی پڑی۔ اس وقت تمام دن کا پروگرام یہ ہوگیا کہ صبح کا ناشتہ اپنی نگرانی میں تیار کرانا اور پھر کھانے کا تمام انتظام کرکے حتیٰ کہ سب کو کھانا کھلا کر دو بجے کے بعد عبدالمجید سالک اور عبدالعزیز انصاری کو عربی پڑھاتے جس سے ان لوگوں کی عربی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔

عصر کی نماز کے بعد آپ راشن لینے کیلئے جاتے تھے واپسی پر پھر کھانے کی نگرانی پھر تقسیم۔ اس کے بعد مولانا احمد سعید کی مجلس ہوتی۔ جسمیں یہ سب حضرات

باتیں کرتے۔ مگر دلی کی یہ ٹکسالی زبان کھلتی تو سب ان کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ یہ وہ وقت ہوتا جب وہ زندگی کے عملی پہلوؤں کو اجاگر کرتے۔ اور ان خوش فہمیوں کو دور کرتے چلے جاتے جو میرے جیسے معمولی سمجھ بوجھ کے نوجوانوں کو زندگی کے بارے میں ہوتی ہیں اکثر خاموشی سے مولانا کی باتیں پشت کی جانب بیٹھ کر سنتا۔ اور اپنے پرانے خیالات کی جگہ ان ٹھوس حقائق کو محفوظ کرتا جاتا۔ جن سے مولانا کی زبانِ فیض ترجمان پردہ اٹھاتی۔ مولانا ان مجالس میں اکثر و بیشتر مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم کی بلند شخصیت کا ذکر فرماتے میں نے محسوس کیا۔ کہ مولانا مفتی صاحب کی فکری صلاحیتوں کے بے حد قائل ہیں۔

ـ ماہ رمضان ـ

اب ہم لوگ تو سی کلاس سے اے کلاس میں آ ہی گئے تھے۔ اب ہی کلاس کی حالت بھی بدل چکی تھی۔ ماہ رمضان میں حکام نے نماز تراویح کی باجماعت ادائیگی کی اجازت دیدی تھی۔ نماز تراویح کے لئے پیش امام مولانا احمد سعید ہی مقرر ہوئے۔ اور اس طرح ہم لوگ ماہ رمضان کی برکتوں سے بہرہ مند ہوتے۔ اس عرصہ میں گاہے گاہے درس و تدریس کی مجلس بھی منعقد ہوتی رہتی تھی۔ پھر بعض تعلیمی مجالس کا انعقاد بھی ہوتا تھا۔ ان کے میر مجلس حضرت مولانا احمد سعید ہی ہوتے تھے۔ رمضان شریف میں ہی ایک روز دوپہر کے وقت مولانا نے چند ہی آدمیوں کی مجلس میں سیرت نبوی صلعم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تب میں سمجھا کہ مولانا احمد سعید جو سیاسی میدان میں بہت آگے جا چکے ہیں۔ صرف سیاسی رہنما ہی نہیں۔ بلکہ ان کے دل میں میرے آقائے نامدار مہر رسول اللہ صلعم کیلئے بھی گہری عقیدت ہے۔

مجھے وہ چھوٹی سی مجلس آج بھی اسی طرح یاد ہے۔ کہ مولانا احمد سعید حضور سرور کائنات فخر موجودات کی قدس زندگی کے صرف ایک چھوٹے سے گوشے پر روشنی

ڈال رہے تھے۔ مگر ایک ایک لفظ کے اندر عقیدت ومحبت کا بے پناہ سمندر رکھتا۔ ان کے منہ سے موتی جھڑ رہے تھے۔ میں نے بھی بہت سے موتی اپنے دامن میں میانوالی جیل کی انھیں مجلسوں میں جمع کئے تھے۔ جن کے روح رواں مولانا احمد سعید تھے۔

تنازعہ اور صفائی

عید الفطر سے دو دن پہلے مولانا احمد سعید سید عطا اللہ شاہ بخاری سے مذاق میں کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ اور یہ عہد کیا کہ میں تین دن تک تم سے بات نہیں کرونگا دوسری جانب جو عید کی تیاری ہو رہی تھی اس کے انچارج مولانا عبد اللہ آٹے والے تھے۔ ان سے اسی بات پر عبد العزیز انصاری بگڑ گئے۔ اب کیا تھا صبح عید تھی۔ اور ہمارے وارڈ کے اندر خاموشی تھی۔ اور ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ اب تو عید کی تمام خوشی خاک میں ملجائیگی۔

شاہ صاحب ادھر ناراض کہ مولانا نے دو دن سے مجھ سے بات کیوں نہیں کی۔ ادھر انصاری صاحب کا غصہ بہر کیف جب صبح ہوئی تو مولانا نے غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کیا۔ تو سب سے پہلے عطاء اللہ شاہ بخاری کے کمرے میں گئے اور ان کو گلے لگاکر بہت ہنسے اور کہا بس ایک ہی جیت میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور ساتھ ہی انصاری صاحب کے کان میں کچھ کہا۔ وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور عید کی نماز جیل کے میدان میں ادا کی گئی۔

لکھنے کو تو بہت کچھ ہے۔ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ اسی پر بس کرتا ہوں کہ اب نظر کا ہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں۔ یہ تمام قافلہ کوچ کر گیا۔ دلی کی آخری یادگار مولانا احمد سعید بھی چلے گئے۔ اب رہے نام اللہ کا۔

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے
آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کیلئے

ختم شد

۷۸۶

۱: جمعیۃ علماء ہند کا بانی اور اس کا معمار

اوّل

۲: حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب

پہلی جنگ عظیم میں ہندوستان کے تمام مقتدر مسلمان رہنما نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ اور حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی اور آپ کے رفقاء کار حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی حضرت مولانا فرید گل صاحب مولانا حکیم نصرت حسین مرحوم مولانا وحید احمد صاحب مرحوم کو مکہ معظمہ سے گرفتار کر کے مالٹا پہونچا دیا گیا اور آپ کے جو ساتھی ہندوستان میں تھے وہ تقریباً سب کے سب ہندوستان میں نظر بند کر دیئے گئے۔ مولانا محمد علی مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کو بھی حکومت ہند نے گرفتار کر کے ہندوستان کے مختلف مقامات پر نظر بند کرایا تھا حکومت کی اس متشددانہ پالیسی کے باوجود جن حضرات نے حوصلہ اور پامردی کے ساتھ ملک کی رہنمائی کی ان میں سب سے پہلے مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحب، مرحوم تھے اور آپ کے ساتھیوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور حضرت مولانا عبدالباری صاحب، مرحوم فرنگی محل کے اسمائے گرامی ہندوستان کی تاریخ سیاست کے صفحہ اول پر نظر آتے ہیں برطانوی استعمار کے خلاف نظر بندوں کی رہائی کے مطالبہ کے عنوان سے تحریک کو منظم طریقہ سے چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ ہندوستان میں جو لوگ تھے انہوں نے اس تحریک کو چلایا۔ اسوقت حضرت مفتی کفایت صاحب مرحوم کے ذہن میں جمعیۃ علماء ہند کے بنانے کا خیال آیا۔ اگرچہ اس سے پہلے مولانا عبدالباری صاحب مرحوم نے علما ہند کے نام سے ایک جماعت کے بنائے جانے کا خیال ظاہر کیا تھا لیکن وہ اپنی کثیر مصروفیتوں کی وجہ سے اسطرف دھیان نہ دے سکے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم نے جمعیۃ علماء ہند کی داغ بیل ۱۹۱۹ء میں دہلی میں ڈالی اس کے قیام اور انتظام و انصرام میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب حضرت مفتی صاحب مرحوم کے شریک کار تھے۔ چنانچہ

حضرت مفتی صاحب کی دعوت پر ہندوستان کے تمام صوبوں سے چنیدہ چنیدہ علما دہلی تشریف لائے تھے میں خود اس بنیادی اجلاس میں شریک نہیں ہو سکا لیکن لدھیانہ سے میرے حقیقی پھوپھی زاد بھائی مولانا محمد عبد اللہ اور مولوی حفیظ اللہ صاحب نے شرکت کی۔ لکھنؤ سے حضرت مولانا عبد الباری صاحب مرحوم تشریف لائے ہوئے تھے۔ علما کے اس نمائندہ اجلاس نے حضرت مفتی کفایت اللہ مرحوم کو جمعیۃ علما ہند کا صدر منتخب کیا۔ اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو ناظم اعلیٰ بنا دیا گیا۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اس کے بنانے میں بھی حضرت مفتی صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ اسمیں حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محل حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم ڈاکٹر انصاری مرحوم مولانا حسرت موہانی مرحوم مولانا عارف ہسوی سب حضرات مفتی صاحب کے شریک کار تھے۔ انہی دنوں گاندھی جی نے کانگریس کے کام کی ابتدا کردی اس کام میں گاندھی جی کے سب سے زیادہ مشیر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ان دنوں علی برادران اور مولانا آزاد جیل میں تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کرچکا ہوں کام کی اہمیت نے اور اخبارات نے مفتی صاحب کے نام کا تعارف ملک بھر میں کرا دیا اہل علم وہ مسلم تھے یا غیر مسلم مفتی صاحب کے علم و دانش کے قائل ہو گئے تھے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا اسوقت ہندوستان کے تمام سیاسی نظر بند رہا کر دیئے گئے تھے۔ لیکن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھیوں کو رہا نہیں کیا گیا اور یہ بدستور مالٹا میں نظر بند رہے ہندوستان کے تمام رہا شدہ رہنما کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کیلئے امرتسر پہونچ گئے۔ اسوقت مسلم لیگ کانگریس کا ایک حصہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ مسلم لیگ کا اجلاس بھی کانگریس کے اجلاس کے ساتھ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم

کی صدارت میں بہت شان وشوکت سے ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد رہائی کے بعد امرتسر تشریف نہیں لائے۔ اس لئے کہ آپ کی رہائی ایسے وقت میں ہوئی جبکہ آپ امرتسر پہونچکر اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ البتہ علی برادران نظر بندی سے رہا ہوتے ہی سیدھے امرتسر پہونچے اور وہیں گاندھی جی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں جمعیتہ علماء ہند کی دوسری نشست ہوئی جمعیتہ کی اس میٹنگ میں بھی میں شریک تھا۔ تقریباً اسی کے قریب ہندوستان کے مقتدر سرکردہ علماء شریک ہوئے میٹنگ امرتسر کے ایک بہت بڑے رئیس میاں محمد شریف مرحوم کی کوٹھی پر ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب اور تمام علماء چونکہ طبعاً پروپیگنڈسٹ نہیں تھے تصوف اور درویشی کا طبیعتوں پر اثر غالب تھا اس لئے یہ حضرات اسوقت عوام میں نمایاں نہ ہو سکے۔ اور نہ ہی نمایاں ہونا چاہتے تھے اس لئے عوامی لیڈرشپ امرتسر میں علی برادران کی طرف منتقل ہوگئی اور خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس کانگریس کے پنڈال میں منعقد ہوا۔ مگر اس موقعہ پر جمعیتہ علماء ہند کا کھلا اجلاس امرتسر میں نہیں ہوا لیکن جمعیتہ علماء کا آئین اور آئندہ طریق کار امرتسر میں ہی تیار ہوا۔ جمعیتہ کا آئین اور طریق کار مرتب کرنا بہت مشکل مسئلہ تھا مگر بقول مولانا عبدالباری مرحوم اگر یہ کام مفتی کفایت اللہ صاحب کے سپرد کر دیا جائے تو یہ مسودہ چند گھنٹوں میں مفتی صاحب تیار کر دیں۔ واقعی جمعیتہ علماء کیلئے ایک آئین اور آئندہ طریق کار کا مسودہ تیار کر کے علماء کے سامنے پیش کرنا اگرچہ یہ اجلاس مختصر تھا مگر فہم اور رہنمائی کے اعتبار سے بہت ہی اہم تھا۔ ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۳۸ء تک مسلسل ۱۹ برس مفتی صاحب جمعیتہ کے صدر رہے رات میں کام کرنا ان کی طبیعت کا خاص وصف تھا۔

آپ کا آل انڈیا خلافت کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ہمیشہ ممبر رہے۔ ورکنگ

کمیٹی میں آپ نے بڑے بڑے الجھے ہوئے مسائل کو منٹوں میں حل کر دیا آپ
نے کانگریس خلافت کمیٹی اور جمیعۃ علماء میں رہ کر جن جن مسائل میں رہنمائی فرمائی
اسکا اندازہ صرف ان ہی حضرات کو ہو سکتا ہے جو آپ کے ہر وقت کے ساتھی
تھے لیکن دنیا نے کبھی بھی مفتی صاحب کے نام کو ان کے کاموں کے ساتھ شہرت
کی جگہ پر نہیں پایا وہ مٹ کر کام کرنیکے عادی تھے۔

جمیعۃ علما کا حقیقی وجود اور اس کی تعمیر میں مفتی صاحب کے ہاتھوں
سے ہوئی اور مولانا احمد سعید صاحب نے پورے اخلاص اور پائیداری
سے مفتی صاحب مرحوم کا ہمیشہ ساتھ دیا مفتی صاحب اپنے ساتھیوں اور
اچھے کام کرنیوالوں کو آگے بڑھا کر خوش ہوتے تھے بہت سے غلط کار
آدمیوں کو محبت اور پیار سے سیدھے راستہ پر ڈال دیا اگر میں یہ کہوں کہ
آپ اپنے وقت میں آفتاب سیاست تھے تو اس بیچ میں کسی کو شبہ نہیں
ہو سکتا اور کون ہے جو اس کی شعاؤں کی روشنی میں ملک کی رہنمائی نہیں کرتا
رہا۔ اور آج بھی سوائے چند ایک کے اس آفتاب سیاست کے غروب ہونے
کے بعد صحیح راستے میں تلاش میں دشواریاں محسوس نہیں کرتے۔

جہاں آپ کو فہم سا کیوجہ سے سیاسیات میں غیر معمولی درجہ حاصل تھا۔
وہاں آپ کی شخصیت کو بحیثیت عالم دین ہونے نمایاں حیثیت حاصل تھی
علم دین میں آپ کا درجہ کتنا بلند تھا اسکا اندازہ آپ کو حضرت مولانا سید انور
شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ مفتی صاحب مرحوم کا ذکر کرتے تو ان کیلئے عالم الدین
والدنیا مفتی کفایت اللہ فرمایا کرتے تحریک خلافت میں حکیم اجمل خانصاحب
مرحوم ڈاکٹر انصاری مرحوم اور گاندھی جی نے جیل جانے سے روک دیا تھا لیکن
۱۹۳۰ء کی نمک سول نافرمانی میں مفتی صاحب بحیثیت کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے

ممبر جیل میں تشریف لے گئے۔ تقریباً چھ ماہ مجھے آپ کی خدمت کرنیکا موقعہ ملا اس کے بعد دوسری مرتبہ ۱۹۳۱ء میں آپ کو پھر ڈیڑھ سال کیلئے جیل میں بند کر دیا گیا اور آپ کو دہلی جیل سے نیو سنٹرل جیل ملتان میں بھیج دیا گیا۔ چنانچہ اس مرتبہ مجھے ایک سال آپ کی خدمت میں رہنے کا موقعہ ملا۔ میری سزا ایک سال تھی اور مجھے لاہور جیل سے ملتان جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ مجھے جسقدر آپ کا قرب حاصل ہوتا گیا اتنی ہی آپ کی عقیدت، عزت اور محبت میرے دل میں گھر کرتی گئی۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کے علاوہ جیل میں اخلاقی قیدیوں سے بھی ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ آپ جیل میں ان قیدیوں کی خدمت کرتے اور ان کے کپڑوں کی مرمت جو ان کو ان کی خدمت کیلئے ملے ہوئے تھے ایک مرتبہ آپ نے اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ یہ بھی ہماری طرح قید میں ہیں ان سے کام لینے کا حق نہیں یہ حکومت کا جبر و قہر ہے کہ ان کو اس طرح ہماری خدمت کیلئے معین کر رکھا ہے۔ اس کی تلافی اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ ہم بھی ان کی خدمت کریں۔ یہ ایک شرعی نکتہ تھا۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ آپ کو کسی شخص کا کوئی کام کرنا بھی بوجھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ سنہ ۱۹ء میں سلطان ابن سعود کے پاس جمعیۃ علما کا ایک وفد بھیجا گیا جس کے صدر حضرت مفتی صاحب مرحوم تھے۔

یہ وفد حج کے موقعہ پر گیا تھا میں اس سفر میں بھی آپ کا ساتھی تھا۔ اس پورے سفر میں مفتی صاحب کی استقامت تقویٰ اور دیانت داری کا جو منظر میں نے دیکھا وہ حیرت انگیز تھا ہم نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کیلئے اونٹوں پر سفر اختیار کیا ہر منزل پر ساتھی تکان کی وجہ سے آرام کرتے یا سو جاتے تھے لیکن مفتی صاحب سب کے لئے کھانا پکاتے تھے اور تیار کرنے میں مصروف ہو جاتے اس تمام سفر میں کبھی آپ کی پیشانی پر کسی نے بھی بل آتے نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی آپ

کے مشاغل دینی اور معمولات میں کسی دن فرق نہ آیا۔

علاوہ فقیہہ ہونے کے فہم قرآن میں بھی آپ کا درجہ بہت بلند تھا جب کبھی مشکل مقامات میں نے مفتی صاحب کے سامنے پیش کئے اسے آپ نے فوراً حل فرما دیا ملتان جیل میں آپ نے ترجمہ کی ابتدا کی افسوس کہ یہ بات آگے نہ بڑھ سکی۔

حضرت مفتی صاحب کے یہ مختصر حالات میں نے بیماری کی حالت میں لکھوائے ہیں اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو جنت الفردوس میں بلند مرتبے عطا فرمائے اور ہمیں ان کے نقش پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین (حبیب الرحمٰن لدھیانوی)

ختم شدہ

آج سے بائیس تیئس برس پہلے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے واقفیت اس ماحول میں ہوئی جو مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری کے نقوش قدسیہ سے قائم تھا جاننے والے جانتے ہیں کہ اپنے وقت کے ان دو بے مثال عالموں میں گہرے مخلصانہ اور بے تکلفانہ تعلقات قائم تھے جو اس وقت کی سردی گرمی کے باوجود ایک رفتار پر قائم رہے۔ ہر دو بزرگوں کے ان تعلقات کی بنیاد یہ تھی کہ دونوں سیدنا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ اور ہند دارالعلوم کے فاضل تھے۔

دونوں مذہبی اور سیاسی عقائد میں فکر و مذاق کی یکسانیت رکھتے تھے دونوں جمعیۃ علماء کے صف اول کے رہنما تھے، دونوں علم و فضل کے بحر بیکراں کے شناور تھے۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کی علمی اور عملی صلاحیتوں اور کمالات کے مرتبہ شناس تھے حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری نے اگر عالم الدین والدنیا کہہ کر مفتی صاحب کو خراج تحسین ادا کیا اور مختلف مواقع پر ان کے متعلق مدح و تعریف کے وہ کلمات کہے جو اپنے معاصرین میں سے کسی شخص کے متعلق ان کی زبان پر نہیں آئے تو حضرت مفتی صاحب نے بھی حضرت شاہ صاحب کی رفاقت و دوستی کا حق ادا کیا ہمیشہ ان کے احترام میں اپنی آنکھیں بچھائیں ہمیشہ ذاتی معاملات میں انہیں خیر خواہانہ مشوروں سے، مستفید فرمایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی وفات جون ۳۳ء پر حضرت مفتی صاحب مرحوم نے سہ روزہ الجمعیۃ میں خود اپنے قلم سے تعزیتی اداریہ سپرد قلم فرمایا تھا۔ اور اس حادثہ عظیم پر اپنے دلی تاثرات کا اظہار کچھ ایسے وزنی اور الفاظ میں فرمایا تھا آج تک میں اپنے قلب و دماغ میں ان کا اثر محسوس کرتا ہوں۔

آج سے پچاس سال پہلے دارالعلوم دیوبند کے انعامی جلسہ منعقدہ ء سے پہلے کی بات ہے دارالعلوم سے چند نو عمر فاضل نکلے مولوی امین الدین صاحب

مولوی محمد کفایت اللہ صاحب شاہجہاں پوری مولوی محمد قاسم صاحب دیوبندی اور محمد ضیاالحق صاحب ابتدا میں ان حضرات نے مختلف مقامات پر کام کیا پھر اس ارادہ سے دہلی میں جمع ہو گئے کہ یہاں ایک مدرسہ امینیہ قائم کریں گے اور فکر و نظر کی آزادی کے ساتھ دینی اور علمی خدمت انجام دیں گے۔ سنہری مسجد دہلی میں انہوں نے مدرسہ امینیہ کے نام سے ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا مولوی امین الدین صاحب اس مدرسہ کے مہتمم قرار پائے مولوی محمد قاسم اور مولوی ضیاالحق صاحب مدرس اور مولوی محمد کفایت اللہ صاحب صدر مدرس دہلی میں اسوقت فتحپوری مسجد کے مدرسہ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم مولانا عبد صاحب دیوبندی مرحوم اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاری مدرس بن کر آ گئے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا عبد صاحب رحلت فرما چکے ہیں اس قافلہ کے صرف ایک مسافر مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاری دیوبند میں موجود ہیں۔ انہوں نے ہی حضرت مفتی صاحب کے انتقال کے بعد ہمیں سنایا کہ سنہری مسجد میں مفتی صاحب مدرسہ کا اہتمام و انتظام کس طرح کرتے تھے اور بے مائگی اور بے سرو سامانی کے باوجود یہ حضرات کس طرح اپنے مقصد پر ڈٹے رہے انہوں نے کتنی تکلیفیں جھیلیں مگر نہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور نہ اپنے مدرسہ کا خالص دینی مسلک اور سادہ و صاف زندگی راہ سے ہٹایا امینیہ کے قیام کے کچھ عرصہ بعد حضرت مفتی صاحب مرحوم نے حضرت مولانا انور شاہ صاحب کو بھی اپنے پاس بلایا جو دار العلوم سے فراغت اور سفر حجاز کر چکے تھے۔ اور کامیابی کے ساتھ درس و افتاد اور وعظ

اور وعظ تقریر کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ امینیہ کے پاس اسوقت نہ کوئی عمارت تھی اور نہ چندہ دفتر تھا اور نہ کتب خانہ نہ مطبخ تھا اور نہ دار الاقامہ مگر یہ چند نوخیز علما جنہیں مستقبل میں رازی و غزالی اور ابن رفیق السید ابن تحردا بن

ہمام کی حیثیت حاصل کرتی تھی۔ روکھی سوکھی روٹیوں پر سنہری مسجد میں جمع رہے دس اور پندرہ روپے ماہوار سے زیادہ کسی مدرس کی تنخواہ نہیں تھی۔ اور یہ معمولی سی تنخواہ بھی آمدنی کے باعث کئی کئی ماہ تک نہیں ملتی تھی آج کے دور میں جب امیرانہ شان وشوکت اور موٹر بنگلہ فرنیچر ریڈیو اور ٹیلیفون کے ساتھ چند تقریریں کرنے اور چند بیانات شائع کرنے کو بہت بڑا ایثار اور بہت بڑی قومی و ملکی خدمت کہا جاتا ہے چالیس پچاس سال پہلے کے اس تصور کو کون سمجھ سکتا ہے کہ چند نوجوان جنکی جبینوں میں مستقبل کی عظمت کامیابی اور عظیم الشان شخصیت کا نور جھلک رہا تھا روٹیوں سے محتاج لباس سے محروم اور ضروریات زندگی کی فراہمی سے مجبور مطلق بے مائگی اور تہی دستی کے ساتھ سنہری مسجد میں جمع تھے اور دینی علوم کی خدمت کیلئے اپنے دن رات ایک کر رہے تھے۔ مظفر نگر میں حکیم فتح محمد خاں صاحب حضرت شاہ صاحب کی اس زندگی کے ایک شاگرد اب تک موجود ہیں علاج کے سلسلہ میں کئی دفعہ حکیم صاحب کے پاس جانیکا اتفاق ہوا اور اس دور کے کچھ حالات ان سے بھی سنے حکیم صاحب کی یہ بات بھی مجھے نہیں بھولتی کہ اسوقت ادب عربی اور فنون میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم کی قابلیت مسلم تھی اور دہلی میں انہی کا ڈنکا بجتا تھا۔

میں شرح چغمینی   سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا مگر انہوں نے پیرانہ سالی کیوجہ سے اس محنت سے معذوری ظاہر کی حکیم صاحب کہتے تھے کہ پھر میں سنہری مسجد میں شاہ صاحب کے پاس گیا اور یہ کتاب انہی سے پڑھی۔

حضرت شاہ صاحب چند سال امینیہ میں رہے پھر اپنے استاد حضرت شیخ الہند کے ارشاد اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تجویز پر دار العلوم میں تشریف لائے مگر مفتی صاحب سے آخر دم تک بہترین تعلقات قائم رہے۔ حضرت شاہ صاحب اپنی وفات سے ۸ سال پہلے

دارالعلوم سے جدا ہو کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے تھے اس ہجرت میں حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب مولانا شبیر احمد صاحب مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب حضرت شاہ صاحب کے ہم قدم تھے ڈابھیل آتے جاتے ہوئے حضرت شاہ صاحب ایک دو روز امینیہ میں مفتی صاحب کے پاس ضرور قیام فرماتے تھے۔ یہ بات آج سے بتیس بائیس سال پہلے کی ہے مگر تصور کی نگاہ اس منظر کو اب بھی دیکھ رہی ہے۔ کہ صبح ۱۰ بجے حضرت شاہ صاحب کشمیری دروازے میں امینیہ کی عمارت کے سامنے تانگے سے اترے اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ مدرسہ کے مہمان خانے میں تشریف لے گئے حضرت شاہ صاحب کے ساتھ ۱۰ سال کی عمر کا ایک بچہ بھی تھا مدرسہ کی بالائی منزل پر اپنے کمرے میں کتابوں اور کاغذوں کے ڈھیر میں عینک لگائے ایک صاحب کو بیٹھے دیکھا قریب پہونچا تو یاد آیا کہ ابھی ایک دو سال پہلے انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں ان صاحب نے بھی تقریر کی تھی۔ ان صاحب سے کسی نے کہا کہ حضرت شاہ صاحب تشریف لائے ہیں۔ بڑے شوق و محنت کے ساتھ یہ صاحب اٹھے اور مہمان خانہ میں آکر شاہ صاحب سے برادرانہ بے تکلفی مگر کمال متانت و سنجیدگی کے ساتھ ملے۔ دوپہر کا کھانا مفتی صاحب کیلئے گھر سے آتا تھا مگر شاہ صاحب کی مہمانداری امینیہ میں ہوتی تھی۔ اور مہمان خانہ ہی میں کوئی صاحب کھانا تیار کرتے۔ اور دونوں دوست جمع ہو کر کھانا کھاتے تھے شاہ صاحب کو اپنے ذاتی معاملات میں مفتی صاحب کی رائے پر اعتماد کامل تھا اپنے گھر کی ضروری باتیں بھی مفتی صاحب سے فرماتے اور ان سے مشورہ لیتے کسی موقعہ پر شاہ صاحب کی اہل خانہ نے اپنی بچیوں کیلئے کچھ زیور اور کپڑے مہیا کرنیکی فرمائش کی اچھی طرح یاد ہے کہ دہلی پہونچکر حضرت شاہ صاحب نے

مفتی صاحب سے اس کا ذکر فرمایا اور ان کا دانشمندانہ مشورہ حاصل کیا دیوبند میں حضرت مفتی صاحب ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب کے گھر پر تشریف فرما تھے مکان سے متصل شاہ صاحب کی ایک افتادہ زمین تھی وہاں لیجاکر مفتی صاحب نے انکار فرمایا اور شاہ صاحب سے پوچھا کہ حضرت یہاں ایک چھوٹا سا مکان مہمانوں کیلئے بنوانے کا ارادہ ہے مفتی صاحب نے انکار فرمایا اور شاہ صاحب نے پھر کبھی اس ارادہ کا اعادہ نہیں کیا۔ ان واقعات سے دونوں کے باہمی تعلقات کی پختگی کا اندازہ کیجئے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ حضرت شاہ صاحب آخر زندگی میں بعض انتظامی مسائل میں اختلافات کی وجہ سے دارالعلوم سے الگ ہو کر ڈابھیل تشریف لے گئے تھے جن مسائل میں انہیں ذمہ داران دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں کارگذار ارکان جمع کئے جائیں حضرت شاہ صاحب نے حضرت مفتی صاحب حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ، اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو ممبری میں لینے کا واضح الفاظ میں مطالبہ فرمایا تھا حضرت مفتی صاحب اپنے اعتدال مگر سنجیدگی و متانت حق گوئی اور مختلف الخیال افراد کو باہم جمع کر لینے کی صلاحیت میں مشہور ہیں ان کی ان صفات کا بڑا اچھا مظاہرہ دارالعلوم دیوبند کے اس زمانہ اختلاف میں ہوا جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ ایک طرف حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ اور دوسری طرف حضرت شاہ صاحب اور ان کی جماعت کے بھی معتمد تھے اختلاف کو سمجھانے کی کوشش کی اور کئی دفعہ بڑے ہولناک کو اپنے تفکر سے پیچھے ہٹا دیا مگر معاملات میں جانبداری کی جو کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ خالص تعمیری نقطہ نظر سے دارالعلوم کے مفاد کی حفاظت فرمائی۔ شخصیات سے کبھی اپنا دامن آلودہ نہیں ہونے

دیا اور پھر دو مخالف طاقتوں سے اس طرح نباہ کی کہ حق گوئی کے باوجود دونوں کی نگاہ
میں معزز و مکرم رہے۔ دنیاوی معاملات کا تجربہ رکھنے والے حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ
دو فریقوں کے درمیان حق گوئی کے ساتھ اپنی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے کو محفوظ
رکھنا اور پھر دونوں کی نگاہ میں مقبول رہنا کتنا مشکل کام ہے۔

مجھے یہ یاد نہیں کہ یہ ملتان کی اسارت کے وقت کا واقعہ ہے یا گجرات
کا بہرحال حضرت مفتی صاحب جیل تحریک کشمیر کے سلسلہ میں کشمیر کے مظلوم
مسلمانوں کی امداد کیلئے رنگون سے آئی ہوئی ایک امدادی رقم ان کے پاس جو کئی
ہزار پر مشتمل تھی۔ جیل جانے سے پہلے حضرت مفتی صاحب نے اپنے صاحبزادہ مولانا
حفظ الرحمن واصف کو تاکید فرمائی کہ یہ رقم حضرت شاہ صاحب کے پاس منتقل کر دی جائے
وہ اس کے مصرف میں اسے خرچ کریں گے۔ اور واصف صاحب نے حکومت کی
قید و بند سے بچ بچا کر آہستہ آہستہ یہ رقم حضرت شاہ صاحب کو بھیج دی۔ یہ واقعہ بہت
پرانا ہے۔ مگر بعض اوقات حافظہ میں اپنا اتنا گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں کہ وہ رسال کی
گرد ان کی تر و تازگی کو فنا نہیں کر سکتی۔

دلی خبر میں ملتان سے لکھا ہوا حضرت مفتی صاحب کا ایک کارڈ آیا کہ میں کل شام
جیل سے رہا کر دیا گیا ہوں۔ آج دہلی روانہ ہو رہا ہوں پرسوں صبح دہلی پہونچونگا۔ یہ دو سطریں
حضرت شاہ صاحب کے لئے ایک پیغام مسرت ثابت ہوئیں۔ وسیع علمی مشاغل اور
بے حد سنجیدگی و وقار کے باوجود مسکراہٹ ان کے چہرہ پر پھیل گئی۔ فرط مسرت سے
غنچہ نورس کی طرح کھل کھل گئے۔ تیسرے دن دہلی تشریف لے گئے اور امینیہ کے
دروازہ پر علم و فضل کے یہ دو سرمایہ دار پرتپاک طریقہ پر ایک دوسرے سے ملے۔
حضرت مفتی صاحب نے عمر بھر کے ان تعلقات کی پاسداری اس حد تک فرمائی کہ ۱۹۴۷ء
سے پہلے حضرت شاہ صاحب کا چھوٹا بچہ انظر جب دہلی گیا تو اس کے ماہانہ اخراجات

کا انتظام مفتی صاحب نے فرمایا۔ وہ ہماہ اسے اپنے پاس بلاکر خروج کیلئے ضروری رقم دیتے رہے اور قدم قدم پر اس کی اصلاح و تربیت کا خیال رکھا۔ پھر جب کبھی الفطر نے انہیں دہلی سے خط لکھا تو واپسی ڈاک سے جواب عنایت فرمایا اس کی والدہ اور بہن بھائیوں کی خیریت اور حالات دریافت فرماتے رہے۔

دنیا کی بے ثباتی اور فنا پذیری موت کی گرم بازاری اور دردناک سا کی کثرت نے ولولۂ حیات کو سرد کر دیا ہے۔ کہنا چاہیئے کہ دل بالکل مرگیا ہے طبیعت بجھ گئی ہے۔ اب نہ جینے کی آرزو ہے اور نہ اسباب زندگی کا شوق جن بزرگوں کے زیر سایہ زندگی کی آنکھ کھولی اور جوانی کا قدم اٹھایا تھا جن کے دامن علم وفضل پر ہمارے بچپن نے شوخیاں کی تھیں اور جن کے کلمات حوصلہ افزاء اور محبت آمیز نظروں سے ہم بے شعوروں ناسمجھوں اور نامرادوں نے کام کرنے کے ولولے حاصل کئے تھے آج ان میں سے کتنے نکہت گل کی طرح وہ تا چمن میں بکھر کر رہ گئے ہیں کتنے شہاب ثاقب کیطرح آسمان سے نیچے گر کر ٹوٹ گئے ہیں۔ کتنی شمعیں سحر بن کر بجھ گئے ہیں کتنے آفتاب سرکوہ کیطرح ڈوب گئے ہیں۔ اپنا سب کچھ لٹ جانے کے بعد بھی اگر انسان اپنے دل کو زخمی اور مجروح نہ پاتے تو اور کیا ہو سچ کہا ہے حفیظ جالندھری نے کہ احباب ہی نہیں ہیں تو کیا زندگی حفیظ۔ دنیا چلی گئی میری دنیا لئے ہوئے۔ آج دل غمزدہ اپنے بزرگوں کے مزارات پر ہجر افراق کے آنسو بہا رہا ہے۔ نگاہ میں ایثار و تقویٰ کی ان بلند مناروں کو ڈھونڈتی ہیں۔ جن کے بدولت آتش زار حیات میں سایہ تھا چھاؤں تھی۔ خنکی تھی اور دعوت تھی ادھر حضرت مولانا انور شاہ کا علم وفضل یاد آتا ہے ادھر مولانا شبیر احمد عثمانی کا مول میں ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اب تک ہمارے درمیان ہی میں موجود ہیں دار العلوم کے جلسہ شوریٰ میں اب پھر کسی قریبی تاریخ میں وہ مولانا حفیظ الرحمٰن

اور مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب کے ساتھ ان کی کار میں تشریف لائیں گے۔ کار دارالعلوم کے احاطہ میں کھڑی رکے گی اور مفتی صاحب اپنے پر وقار انداز میں لمبے لمبے قدم زمین پر رکھتے ہوئے میرے دفتر کے سامنے سے گذر کر دارالمشورہ میں تشریف لے جائیں گے ہائے موت کے سخت گیر ہاتھ نے ہم سے بہت بڑی دولت چھین لی ایک ایسا شخص ہم سے جدا ہوگیا جس نے معمولی سی چٹائی پر بیٹھ کر دین و شریعت کے مسائل سلجھانے حکمت و سیاست کی گرہیں کھولدیں معاملات کی پیچیدگیوں کو سلجھادیا جو خاموش رہ کر صرف اپنے دشمنی افراد ذاتی وجاہت سے مسائل کو ان کی اصل حدت کے معیار پر چل کر ستعاحق تعالیٰ ان سے راضی ہو کر انہوں نے اللہ کے دین کے لئے بڑی محنت کی اور پرائیوں سے نہیں اپنوں سے بھی دکھ اٹھائے۔

(ازہر شاہ)

ختم شد

چراغ میرا ہے
رات ان کی

مولانا عطا اللہ شاہ بخاری کا ایک ہندو ارادت کیش

مقرر تو آپ نے دیکھے ہوں گے۔ اور سنے بھی ہوں گے۔ لیکن جس مقرر کا ذکر میں کرنے چلا ہوں۔ وہ مقرر نہیں خطیب تھا۔ ORATOR نہیں بلکہ ایک جادوگر تھا۔ وہ جب اسٹیج پر آکر کھڑا ہوتا۔ اور مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہتا۔ مسلمانوں! تو یقین جانئے ہوائیں اور فضائیں بھی گوش برآواز ہو جاتیں۔ انسان اپنے دل کی دھڑکنوں کو روک کر اس مقرر کی باتیں سنتے تھے۔ کہ کہیں کوئی لفظ ہماری دھڑکن میں غائب نہ ہو جائے۔

اس کی آواز میں جادو تھا۔ اس کے انداز میں جادو تھا۔ اس کی بات میں جادو تھا۔ ایک سچائی۔ ایک خلوص۔ وہ سچا تھا۔ وہ مخلص تھا۔ وہ قوم کا سپاہی تھا دلش کارہنما تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ حقیقت میں ایک صحیح انسان تھا۔

بٹوارے کے بعد وہ ہم سے بچھڑ گیا۔ اور پاکستان سرکار نے اس کے منہ پر تالا لگا دیا۔ قانونی تالا لگا دیا۔ اور اسکی زبان بند ہو گئی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی۔ کہ وہ سننے والوں کو چاہے وہ کسی مذہب سے متعلق ہوں۔ کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں۔ اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا۔

وہ مقرر ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک انگریزوں سے لڑتا رہا۔ اس کا کہنا تھا۔ کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہمیں یہاں بدیسیوں کا راج نہیں چاہیئے۔ اس نے گاندھی جی کی اہنسا کے اصول کو اسلام کا اصول مانا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ لاہور موچی دروازہ کے باہر اس نے ایک تقریر میں مہاتما جی کی اہنسا کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے کہا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب لوگ پتھر مارتے تھے۔ اور ان کی پنڈلیوں سے خون بہتا تھا۔ تو کیا وہ اہنسا نہیں تھی۔ وہ چاہتے تو کیا اپنے خدا سے ان کافروں

بربادی کیلئے دعا نہیں مانگ سکتے تھے۔ وہ چاہتے تو کیا نہیں کر سکتے تھے۔ لعنۃ لعنۃ
محبوب خدا اور لوگوں کے ظلم کا نشانہ زبان پر خاموشی اور اللہ سے ان پر رحمت نازل
کرنے کی دعا۔ یہ عدم تشدد نہیں تو اور کیا ہے۔ مسلمانوں! جو بات تمہیں کہنی چاہیے
وہ گاندھی کہہ رہا ہے۔ اسی خطیب نے دہلی کی احرار کانفرنس میں مسلمانوں سے سوال
کیا، کہ تم جو آج پاکستان مانگتے ہو۔ اور دیش کا بٹوارہ چاہتے ہو کس لئے؟ تب ایک
مسلمان نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ اس لئے کہ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مانگ
ہے۔ بٹوارہ چاہتے ہیں، اور مسلمانوں کا ایک آزاد ملک مانگتے ہیں۔ اور جس طرف لوگ
زیادہ ہوتے ہیں، وہی بات سچی ہوتی ہے۔ اور سچی بات حکومت کو ماننا پڑتی ہے۔

تب اسنے کہا۔

کیا ایک آدمی جھوٹا اور بہت سے مل کر سچے ہو جاتے ہیں۔ میرے بھائی سچائی
کیطرف اس زمانے میں لوگ کم ہیں۔ اور پھر وہ جوش میں آکر بولا۔ میرا ایمان ہے
سچ ایک ہوتا ہے جھوٹے بہت ہوتے ہیں۔ میں اگر اسوقت حساب کا ایک سوال حل
کرنے کو دوں اور سب اس کا جواب لکھیں۔ تو سچا ایک ہوگا۔ اس پر سوال کرنیوالا
کچھ سوچنے لگا۔ تب اس مرد مجاہد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ جھوٹے جواب کئی ہونگے
اور سچا۔۔۔۔۔ ا

ایک کا صرف ایک ہوگا۔ (MAJORITY) مجازی کی طرف جھکنے والو یہ
حقیقت ہے۔ مجازی کی۔ افراط و تفریط میں سمجھاتے ہو۔ ہم ایک، خدا اور ایک
پیغمبر کے ماننے والے ہیں۔ یہ ان سے کہو جو تیتیس کروڑ کو خدا مانتے ہوں۔ عزیزمن
سچائی ایک ہے اور اس سچائی کے پیچھے سب کو چلنا چاہیئے۔ اور پھر وہ شیر کی
طرح گرجا۔ دیش کے ٹکڑے کرنیوالو! تمہاری آنکھیں نہیں ہیں۔ لیکن میں دیکھ رہا
ہوں۔ کہ بٹوارے میں خون کی ہوس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور مجھے تو حیرت

اس بات پر ہوتی ہے۔ کہ یو۔ پی کا مسلمان۔ کلکتہ کا مسلمان۔ بہار کا مسلمان بٹوارے کی حمایت کیوں کرتا ہے۔ کیونکہ اگر پاکستان ملا بھی تو مجھے ملیگا۔ پنجاب سرحد اور پاکستان میں کیسے آسکتا ہے۔ بٹوارے کی لکیر جو تمہارے قائد اعظم نے ہندوستان کے نقشہ پر کھینچی ہے۔ اس نے یو۔ پی۔ بہار اور بنگال کے مسلمانوں کو الگ کر دیا ہے۔ یہ دہلی کی جامع مسجد تقسیم میں تمہارے حصے میں نہیں آئیگی۔ ہندوستان کی گنگا جمنا تہذیب۔ ہمارا یہ مشترکہ کلچر صدیوں میں بنا ہوا تمدن۔ اس کا بٹوارہ کیسے ہو گا؟

تب ایک یو پی کے مسلمان نے کھڑے ہو کر کہا۔

شاہ جی ہم یو پی والوں کو بھلے ہی کچھ نہ ملے ہم اسمیں خوش ہیں۔ کہ پنجاب کے مسلمانوں کو تو ایک آزاد ملک ملیگا۔ آپ کو تو ایک اسلامی ملک ملیگا۔ جہاں شرعی حکومت ہوگی۔ جہاں مسجد کے آگے باجا نہیں بجے گا۔ جہاں شراب حرام ہوگی۔ سور حرام ہو گا لوگ نمازی اور پرہیزگار ہوں گے۔ جہاں کا قانون شرعی ہو گا۔

تب شاہ جی کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اور جذبات پر قابو پا کر انہوں نے کہا۔ بھائی مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ پاکستان میں حکومت شرعی نہیں ہوگی۔ بلکہ تمہارے قائد اعظم کی جیسی تہذیب ہے جیسا ان کا ذاتی کلچر ہے۔ وہ رنگ پاکستان میں نظر آئیگا۔ پردہ مردوں کی عقل پر پڑیگا اور عورتیں عریاں گھوما کریں گی۔

اب وہ آدمی جھلا گیا۔ اور بولا۔ خدا کی قسم شاہ جی اعتبار کیجئے۔ ہم مسلم لیگ والے چاہتے ہیں کہ آپ مسلمانوں کو ایک اسلامی ملک مل جائے تب شاہ جی نے اس کے منہ کا جملہ توڑ لیا۔ اور بولے۔ یہاں صاحبزادے تم مسلمانوں کا کیسے بھروسہ کروں۔ تم انگریز کی فوج میں بھرتی ہو کر جاتے تھے۔ تیرہ روپے تنخواہ پاتے تھے اور مدینہ مکہ پر گولی چلا آتے تھے۔ پھر ہندو کی فوج میں بھرتی ہو کر پاکستان پر گولی نہیں چلاؤ گے۔

اس بات پر پنڈال میں سناٹا چھا گیا۔ اور پھر شاہ جی پاکستان اس کے خیال اور اور اس کے رہنماؤں کے خلاف یوں بول رہے تھے۔ جیسے کوئی عربی گھوڑے پر سوار تلوار کے بیچھے مڑے ہاتھ پھینکتا چلا جائے۔

دشمن میدان سے بھاگ گیا تھا۔ اور خطابت اس پنڈال میں دانتوں تلے انگلی دابے حیران تھی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ ! . سعدی

یہ خطیب کون تھے ؟

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری جو ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شام کو ملتان (پاکستان) اسلامی شرعی سرزمین کو چھوڑ کر اس سرزمین میں جا بسے جہاں سوائے سچائی کے کچھ نہیں ہے۔

میں نے اس بزرگ مجاہد کو قریب سے دیکھا ہے۔ اس کی باتیں سنی ہیں۔ وہ سچا مسلمان تھا۔ پکا دیش بھگت تھا۔ اور ایک عظیم انسان تھا۔ کسی نے کہا ہے۔ بڑے آدمی کے قریب مت جاؤ نہیں تو تمہیں اس سے نفرت ہو جائے گی۔ اور میں کہتا ہوں۔ بڑا آدمی وہی ہے۔ جس کے جتنا قریب جائیے اس کی عظمت بڑھتی جائے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بارے میں یہ کہتے ہوئے میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ کہ وہ ان بلند ہستیوں میں سے ایک تھے جن کیلئے دل میں روز بروز عقیدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آج جب وہ پاکستان کی پاک دھرتی پر نہیں رہے تو عقیدت اور بڑھ گئی ہے۔ میرے دل میں بیٹھا کوئی بار بار مجھ سے کہہ رہا ہے۔ یہ عقیدت نہیں عبادت ہے۔ یہ شردھا نہیں بھگتی ہے۔ اور بھگتی (عبادت)

رہی ہوتی ہے جو پل پل بڑھتی جائے۔

پہلی بار میں نے شاہ جی کو لاہور کے ایک جلسے میں دیکھا۔ وہ انہی دنوں جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ جیل جانے کی بات انوکھی تھی۔ یوں کہ معاملہ وطن کا نہیں، تھا مذہب کا تھا۔ تقریباً یہی بات تھی۔ جس کے لئے آج ایڈیٹر پرچم ہند نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

آپ جانتے ہیں۔ انگریز کی ہمیشہ سے ہندوستان پر حکومت کرنے کی یہ پالیسی ایسی ہے کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔ پھوٹ ڈالنے کیلئے ہندوستان کی دھرتی پر جے چند اکثر مل جاتے ہیں۔ جب پنجاب اسمبلی کا الیکشن سر پہ آگیا۔ تو پنجاب کے مسلمانوں کو مذہب کے جھنڈے تلے جمع کرنے کیلئے پنجاب کے کسی سکندری بخت والے نے "شہید گنج" کا نعرہ لگا دیا۔ لاہور میں سکھوں کا ایک گوردوارہ سیس گنج کہلاتا تھا۔

سکندری شگوفہ یوں چھوڑا گیا۔ کہ یہ گوردوارہ نہیں مسجد ہے۔ سیس گنج نہیں شہید گنج ہے۔ اور پھر سرکاری کاغذوں کے حوالے تاریخ کے صفحات سب چھان پھٹک کر رکھ دیئے گئے۔ لاہور کی فضا نعرۂ تکبیر اور ست سری اکال کے نعروں سے گونجنے لگی۔ اسلام زندہ باد کے فلک شگاف نعروں نے ماحول کو حرارت کر دیا مجلس احرار اسلام نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ یہ مسجد نہیں بلکہ (POLITICAL STUNT) سیاسی جادوگری ہے۔ اس جھگڑے میں مت پڑو۔ مگر سادہ دل مسلمان جو بیچارا شہید یا غازی بننے کیلئے "کمر باندھے ہوئے چلنے کو" تیار بیٹھا رہتا ہو، ایسا اچھا موقعہ ہاتھ سے کیوں جانے دیتا۔ پنجاب کے مسلمان سر پر کفن باندھ کر گوردواروں کیطرف بڑھنے لگے۔

اس شہید گنج تحریک کے پہلے ڈکٹیٹر عزیز دوست آغا شورش کاشمیری

تھے۔ بادشاہی مسجد میں ہم بھی گئے۔ شورش کی ہنگامہ خیز تقریر پر ایک جوش ہنگامہ نعرے اور پھر شورش کی گرفتاری اور اس کے بعد لاہور میں ایک خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی۔ دن میں تین تین بار پولیس نے گولی چلائی۔ لوگ اسلام کے نام پر شہید ہوئے علامہ مشرقی کی پوری بیلچہ تحریک (رضاکار تحریک) اسی مذہبی تحریک میں سر سکندر حیات کے ہاتھوں شہید ہوگئی۔ موقعہ نازک تھا جو نعرہ نہ لگاتا اس پر کفر کا فتویٰ لگ جاتا یہ سارا STUNT اسٹنٹ تھا احرار کو کچلنے کا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ان دنوں لاہور سے باہر تھے ان کی ساری زندگی ریل اور جیل میں بیتی۔ سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں اور وہ تین سو چھیاسٹھ تقریریں کرتے اور بات ایک ہی مسلمانوں آزادی کے بنا تم مسلمان ہی نہیں رہ سکتے۔

جگہ آزادی کی یا تختہ مقام آزادی کا جب ہمارے رسول کریم نے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ معاہدے کئے تو ہم اس آزادی کی لڑائی میں ہندو کے ساتھ سمجھوتہ کیوں نہیں کر سکتے۔ اور تمہیں جو یہ شبہ ہے کہ ہندو آزادی کے بعد تمہارا حق کھا جائیگا تو یہ تمہارا وہم ہے۔ ارے ظالموں جو سانپ کو دودھ پلاتا ہے وہ تمہارا حق کیسے کھا سکتا ہے۔

شاہ جی کی تقریروں سے پنجاب کا ماحول کافی نکھر چکا تھا۔ اور سیاسی حلقوں کا خیال تھا کہ اب پنجاب میں دلیش بھگتوں کی ہی وزارت بنے گی۔ مگر سکندر حیات سیاست کی بساط پر انگریز کا مہرہ تھا اس نے احرار کو شکست دینے کے لئے پروگرام بنا دیا احرار نے کہا یہ انگریز کا سٹنٹ ہے پنجاب کے مسلمانوں نے کہا۔ تم بزدل ہو تم کافر ہو تم سکھ ہو۔

شاہ جی خبر پا کر لاہور آ گئے دہلی دروازہ کے باہر احرار کے دفتر میں سب احراری سیاستدان جن کے بارے میں سر فضل حسین کہا کرتے تھے کہ ان کے

پاس چھ والنٹیر اور تین روپے ہوں تو یہ سوچتے ہیں کسی ریاست پر دھاوا بول دیا جگ وہ آنج سر سکندر کی وجہ سے دبک گئے تھے شاہ جی کی آمد نے ان میں ایک پھرتی پیدا کی سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے شاہ جی نے مسکرا کر چودھری افضل حق سے پوچھا کیوں چودھری تم اس قوم کے لیڈر رہو ....

چودھری نے جملہ خود یوں پورا کیا جو قوم میری شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر چکی ہے اسے امیر شریعت مان چکی ہے اس قوم کے

شاہ جی نے ہنستے ہوئے کہا جی ہاں آپکی قوم مسلمان سبحان اللہ اس قوم کی تاریخ اور وہ یہ ہے کہ پہلے یہ آدمی کو خدا بناتی ہے پھر اس پر کفر کا فتویٰ لگاتی ہے پھر اسکو قتل کرتی ہے ۔ پھر اس پر سجدہ کرتی ہے ۔ پھر اس کا مزار بناتی ہے ۔

چودھری صاحب بولے کیا کریں شاہ جی اپنی قوم سادہ دل ہے ۔ دشمن شاطر ہے قوم کے لیڈر ہی اکھٹرے میں مولانا ظفر علی خان پنے پٹائے بیٹھے تھے ۔ شہید گنج کے سہارے اتحاد ملت کے نام پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں ادھر ایک فیل سکندر حیات ہے جو لڑتا ہے اور مہرے کے مہرے صاف کئے دے رہا ہے

اگر ہم اسوقت ہم میدان میں نہ اترے تو بازی چوپٹ ہو جائیگی ۔ پاکستان کی ایک نیو پہ شہید گنج بھی بنے گا ۔

کانگریس بیچاری اس مسجد کے معاملہ میں ہیرا گئی بنی کھڑی ہے یہ مسئلہ دیش کا نہیں مذہب کا ہے صرف مسلمانوں کا ہے آپ چاہیں تو اس ساری تحریک کا رخ آزادی کیطرف موڑ سکتے ہیں ۔ لوگ انگریز کی گولیوں سے مر تو رہے ہیں اگر یہی آزادی کیلئے جذبہ پیدا ہو جائے تو سبحان اللہ تھوڑی دیر کے بعد لاہور کی سڑکوں پر احراری والنٹیر ڈھنڈورا پیٹنے لگے ۔ کہ کل شاہی مسجد میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مسئلہ شہید گنج پر اپنے خیالات کا

اظہار فرمائیں گے۔

جمعہ کا دن احرار کا اعلان شاہ جی کی تقریر اور شہید گنج جسے احراری پولیٹیکل سٹنٹ کہتے چلے آئے ہیں۔ بھلا وہ کیا دیکھیں گے اس اشتیاق سے لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر شاہی مسجد کے اندر اور باہر امڈ پڑتا تھا حضوری باغ مسجد کی سیڑھیاں آنگن تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ شاہ جی نماز کے بعد منبر پر آ گئے انہوں نے کلام پاک سے جلسے کا آغاز کیا لوگ اپر سکون بیٹھے رہے۔

لیکن جب شاہ جی نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا اے پنجاب کے سادہ دل مسلمانوں یہ مسئلہ شہید گنج کا نہیں بلکہ انگریز نے تمہارے لئے ایک قبر کھودی ہے جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی لوگوں نے گالیاں دینی شروع کر دیں واہیات گالیاں جو عام طور پر بھڑکا ہوا مسلمان دیتا ہے۔ اور پھر پتھر بھی برسنے لگے۔ شاہ جی تھوڑی دیر چپ چاپ کھڑے ہوئے تماشہ کرتے رہے جیسے یہ گالیاں اور پتھراؤ ان پر نہیں کسی دوسرے کی مذمت کی جا رہی ہو۔

لیکن عوام مشتعل ہوتے جا رہے تھے۔ شاہ جی نے اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے رومال سے اپنا منہ ڈھانپ لیا اور تلاوت قرآن پاک شروع کر دی۔ ان کی قربت سبحان اللہ وہ رس کے ساگر تھے۔ ان کی آواز اتنی مرلی اور انداز اتنا خوبصورت تھا کہ میں ہندو ہوتے ہوئے بھی کلام پاک کا رس لیتا تھا میں نے ان کی تقریر میں سکھوں عیسائیوں اور برہمنوں کو بھی محویت کے عالم میں دیکھا ہے یہ کلام پاک کا کمال تھا یا ان کے اندر خوانا نیست کیلئے ایک پیار سا تھا اس کا اثر تھا خدا جانے پر میں آج بھی اتنا ہی جانتا ہوں کہ شاہ جی کچھ باتیں من ہی من رس گھولتی رہتی تھیں۔

شاہ جی کے منہ سے قرآن پاک سن کر جب ہندو بھی اپنی سدھ بدھ کھو دیتے تھے

تو پھر مسلمانوں کا کیا حال۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر او شنڈا پڑ گیا لوگ خاموش ہو گئے۔ تب شاہ جی اپنے چہرے پر سے رومال ہٹا کر بولے۔

مسلمانوں جانتے ہو میں نے منہ کیوں ڈھانپ لیا تھا؟ اس لئے کہ قیامت کے دن اگر میرے نانا تمہارے نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے پوچھیں کہ بتاؤ تمہیں سچ بولنے پر کس نے پتھر مارا تھا تو میں تمہاری صورتیں شناخت نہ کر سکوں۔

یہ جملہ سنتے ہی مسلمان دہاڑیں مار کر رونے لگے یہ ڈائیلاگ نہیں تھا یہ مسلمانوں کا عقیدہ تھا اور یہ عقیدہ ایک ازلی احترام کے ساتھ شاہ جی کے دل کی گہرائیوں سے طلوع ہو رہا تھا۔

پھر مسجد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور اسلام زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ اب شاہ جی جلال میں آ گئے۔ اور انہوں نے لاہور کے مسلمانوں کو یوں خطاب کیا۔

اے کرنے والے یہ لاہور نہیں کوفہ ہے ایک حسین ابن علی وہاں شہید ہو گئے۔ یہ ایک محمد کا نواسہ یہاں شہید ہو جائے گا۔

یہ لاہور کس مٹی پر بسا ہے جانتے ہو اس کی تاریخ پرانی ہے۔ سنو میں بتاتا ہوں۔ جب کربلا کے میدان میں حسین شہید ہو گئے تو وہاں سے مٹی کا ایک بگولا اٹھا جسے فضاؤں نے آسمانوں نے زمینوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اس کیلئے جب کہیں ٹھکانہ نہ رہا تو وہ اڑتا ہوا اس راوی کے کنارے آ گیا یہاں اسے پناہ مل گئی اسی مٹی سے تمہارا خمیر اٹھایا گیا ہے۔ بات بھیانک تھی یہ بات نہیں شاہ جی کی گالی تھی جو انہوں نے لاہور کے مسلمانوں کے لئے وضع کی مگر سبحان اللہ کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب بد گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ یہ مٹھاس آواز

میں یا انداز میں نہیں تھی بلکہ شاہ جی کے دل میں جو اپنی قوم کیلئے درد تھا وہ ان کی گالیوں میں بھی تھا۔ وہ گالی نہیں ان کا بزرگانہ خلوص تھا۔ مجمع میں سے ایک بوڑھا مسلمان روتے روتے روتے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

شاہ جی سانوں ماف کر دیو سانوں یقین اے جیسے تسی احرار والے اس شہید گنج نوں من لوڑ دے تے انگریز نال ستھا چالاؤ تے انگریز دا پیو دی نال نہیں کر سکدا۔

شاہ جی نے کہا بابا یہ سیاست ہے ہماری زندگی اسی میدان میں گذری ہے ہم نے آدھی زندگی جیل میں اور آدھی ریل میں بتائی ہے پھر بھی آج تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم انگریز کے ساتھ ٹکر لیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ خدا کی قسم اب تو جیل اپنا گھر معلوم ہونے لگا ہے۔

پھر مسجد امیر شریعت کے نعروں سے گونجنے لگی۔

شہید گنج کا معاملہ الجھا ہوا تھا احرار نے سمجھانے کی کوشش کی اور آخر میں سیاست ان کے آڑے آئی وہ جیل میں چلے گئے۔ شہید گنج کا مقدمہ عدالت میں تھا بمبئی سے قائد اعظم محمد علی جناح دس ہزار روپے اپنی فیس لیکر لاہور گئے اور مقدمہ ہار کر چلے آئے آزادی آزاد ہوئے تو لاہور میں ایک روزہ کانفرنس تھی آغا شورش کاشمیری اتحاد ملت کو چھوڑ کر مجلس احرار میں شامل ہو گئے تھے۔

دن کو شورش کاشمیری کی تقریر تھی دبلا پتلا نوجوان عظیم شاعر، لاجواب مقرر دو قدم نثر کی سرزمین میں گل بوٹے بکھیرے تو تیسرے قدم پر شاعری کے پھول کھلا دے۔

اس نے شہید گنج کے پس منظر میں انگریز کی راج نیتی کو ایسا اجاگر کیا کہ شہید گنج سب قوم سب آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور سامنے صرف انگریز رہ گیا۔ جو

ہندوستانیوں کی سادگی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اور پھر اس نے شہید گنج کے بڑے بڑے لیڈروں کی قلعی کھولی۔ شورش کاشمیری کی تقریر کے بعد۔ شاہ جی کی تقریر تھی انہوں نے شورش کیخلاف بولنا شروع کیا وہ کہنے لگے۔

مجھے یہ بات اکھرتی ہے کہ تم ان کے اسٹیج پر جاتے ہو تو ہمیں گالیاں دیتے ہو ہمارے اسٹیج پر آتے ہو تو ان کو گالیاں دیتے ہو تم لوگ کیسے ہو۔ وفاداری بشرط استواری اصل ہے مجھے کیا چلو کاوش چلیں بیں شاہ جی کے جذبات میں کھویا ہوا ان کی تقریر کا مزا لے رہا تھا اور یہ بھی بھول گیا کہ میرے ہی دوست کی پگڑی اچھالی جا رہی ہے۔

شورش نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

شورش کھڑا ہو چکا تھا میں اٹھا ہی چاہتا تھا کہ شاہ جی غصے سے چلائے۔ رضاکار دروازہ بند کر دو پنڈال سے باہر کسی کو نہ جانے دینا۔ یہ چیخ سننے سے بھاگتے ہیں پتہ نہیں ان کی آواز میں کیا جادو تھا ہم دونوں بیٹھ گئے۔ لیکن شاہ جی کی تقریر ختم ہونے سے پہلے ہم پنڈال سے جا چکے تھے۔

دوسرے دن چودھری افضل حق میرے پاس آئے وہ شورش بھائی کی تلاش کر رہے تھے چودھری صاحب کو رات کے واقعات پر افسوس تھا میں نے انہیں بتایا کہ اب شورش کاشمیری احرار کے دفتر میں نہیں آئیگا۔

چودھری صاحب تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے اور پھر شام کو امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری خود شورش کے گھر پر تھے

شورش کاشمیری کا گھر ایک کمرہ تھا جس میں تمام بہن بھائی سب رہتے تھے۔ گھر میں بیٹھانے کو جگہ نہیں اور امیر شریعت دروازے کی چوکھٹ سے باہر کھڑے ہیں۔

شورش مجھے انہیں گلی کے باہر ایک بند دکان کے چبوترے پہ لے بیٹھا سارا محلہ اکٹھا ہو گیا اور امیر شریعت زندہ باد ہونے لگی۔ پھر بھی شورش کاشمیری مجلس احرار اسلام ہند کا جنرل سکریٹری ہوا۔ اس نے احرار کے جھنڈے تلے ہندوستان کی آزادی کیلئے اپنی جوانی کے بارہ برس جیل میں گذار دیئے۔

شاہ جی کی محفلیں خوب سجتی تھیں سیاست، ادب اور شاعری ان کے دربار کی لونڈیاں تھیں اسلام ان کی زندگی تھا اور وطن کی آزادی ان کا مذہبی فریضہ ہندو کہتے تھے ان کی زبان پر سرسوتی بیٹھی ہے۔ اور مسلمان کہتے تھے دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ شاہ جی اردو فارسی ہندی پنجابی بہاری اور بھوجپوری زبان میں شاعری بھی کرتے تھے۔ اور فی البدیہہ کہتے تھے۔ ایک بار ہم سب دوست شام کے قریب شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ بنگال میں قحط پڑا تھا اور ساحر لدھیانوی نے ایک نظم لکھی تھی۔ شورش نے ساحر کی نظم کی تعریف کی شاہ جی نے

تصدّق احمد خاں شیروانی
۱۸۸۴ء

بیرسٹر تصدق احمد خاں شیروانی مرحوم ہندوستان کے مشہور اور اعلیٰ مرتبت قوم پرست رہنما تھے۔ ۱۸۸۴ء میں مونا ضلع ایٹہ کے مشہور شیروانی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالرشید خاں شیروانی بڑے زمیندار تھے۔ شیروانی پٹھان علی گڈھ اور ایٹہ کے اضلاع اور ان کے گرد و نواح میں چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی زمینداریاں رکھتے تھے۔ اس شیروانی برادری میں تصدق احمد خاں شیروانی اور ان کے دو حقیقی بھائی نثار احمد خاں شیروانی اور فدا احمد خاں شیروانی بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اور اور اس کے بعد مشہور ہوئے۔ اور سیاست میں کافی نام پایا۔ سرکاری لوگوں میں اللہ خاں شیروانی نے بڑا نام پایا۔ برطانیہ سے سر اور نوابی کا خطاب پایا۔ بے پایاں دولت حاصل کی اور عرصہ دراز تک علی گڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ان کی برطانیہ پرست سیاست کی بنا پر شیروانی برادرس سے ان کی ہمیشہ مخالفت رہی

تصدق احمد خاں کے بچپن میں سر سید احمد خاں کے اثر و زندگی کے آخری دن گذر رہے تھے۔ اور تعلیمی اثر کے تحت قصبہ چھرہ ضلع علی گڈھ شہر میں شیروانی انگلش اسکول قائم کیا گیا تھا۔ یہ مقام علی گڈھ شہر سے پچھم میں کوئی ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے اور اس کے آس پاس کے مواضعات میں ہزاروں شیروانی لوگ آباد ہیں۔ یہ جگہ ان لوگوں کا نہایت عمدہ تعلیمی مرکز بن سکتا ہے۔ اس شیروانی انگلش اسکول میں چند برس تصدق احمد خاں نے ابتدائی اور کچھ ثانوی تعلیم حاصل کی۔ جلد ہی ان کی شادی پر ہرہ ضلع ایٹہ کے رئیس اعظم احمد سعید خاں شیروانی کی بیٹی سے ہو گئی۔ اور اپنے خسر کی امداد سے علی گڈھ میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہ زمانہ ۱۹۰۷ء کا تھا۔ جب تقسیم بنگالہ کی وجہ سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف مسلمانوں میں بڑی تیزی سے ہیجان پھیل رہا تھا۔ برطانیہ پرست مسلمان رہنماؤں کی وجہ سے عام مسلمان اس تحریک سے علیحدہ رہے۔ پھر

بھی چند مسلمان نوجوان ملک میں ایسے بھی تھے جو کسی قیمت برطانیہ کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھے۔ وہ برادرانِ ملک کا ساتھ دینا چاہتے تھے۔

ان دنوں علی گڈھ کالج مسلمانوں کا تہذیبی اور سیاسی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ سر سید کے بعد نواب محسن الملک اور وقار الملک ایسے لوگ تھے جو تعلیمی کاموں کے علاوہ تہذیبی اور سیاسی باتوں میں بھی حصہ لیتے رہے تھے۔ اور برطانوی سرکار جانتی تھی کہ مسلمانوں کے نزخرے پر ان کا ہاتھ رہے گا۔ جب چاہے گی اس کو دبا دیگی۔ اپنی گرفت ڈھیلی کر دیگی۔ جہاں جب کوئی مسلمان ہندوستان، دوستی کی آواز نکالتا تو اس کی گردن علی گڈھ کی مدد سے دبا دیجاتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان تو اس زمانے میں تھے ہی نہیں۔ ہندو تعلیم یافتہ بھی کم ہی تھے۔ اپنی برطانیہ شناسی اور برطانیہ پرستی کی وجہ سے سر سید ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے کالج کے اساتذہ زیادہ سے زیادہ یوروپین ہوں۔ اس لئے سوائے مسٹر چکرورتی جو ریاضی کے پروفیسر تھے۔ قریب قریب سب مضامین کے اعلیٰ پروفیسر انگریز ہی تھے۔ ان میں سے چند خود سر سید کے رکھے ہوئے تھے۔ کسی معمولی سی مقامی بات پر انگریزی پروفیسر طلباء کالج سے ناراض ہو گئے۔ اور انہوں نے استعفیٰ کی دھمکی دے دی۔ یہ واقعہ علی گڈھ کی تاریخ میں ۱۹۰۷ کا اسٹرائک کہلاتا ہے۔ اس میں چند دن طلباء کالج نے اسٹرائک کئے رکھا۔ اور اسٹاف کے دباؤ سے چند طلباء جو بورڈنگ ہاؤس میں سیاسی مذاکرات زور شور سے کیا کرتے تھے۔ کالج سے نکال دیئے گئے۔ تصدق احمد خاں شیروانی بھی ان چند مبارک طالب علموں میں تھے۔ جو کالج سے نکالے گئے تھے۔ اس زمانہ میں عبد المجید خواجہ، ڈاکٹر سید محمود اور ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری تصدق احمد کے خاص دوستوں اور ہم جولیوں میں تھے۔ ۱۹۰۷ء کا یہ اسٹرائک پہلی آواز تھی۔ جو ۱۸۵۷ء کی لغاوت کے بعد

کسی مسلمان کے حلق سے برطانیہ کے خلاف نکلی تھی۔ اس کے کچھ دنوں اپنے خسر کی امداد سے تصدق احمد خاں مزید تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے۔ وہاں کیمبرج سے ایم۔ اے کیا اور لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی۔ جس زمانے میں جواہر لال، کیمبرج اور لندن میں تھے۔ اسی زمانے میں تصدق احمد خاں بھی وہاں تھے۔ جواہر لال نے اپنے خود نوشت حالات میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ جواہر لال اور تصدق احمد خاں شیروانی کی دوستی انگلستان سے شروع ہوئی اور ان کے مرتے دم تک برقرار رہی۔

۱۹ء میں جب جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کا غلغلہ ہندوستان میں بلند ہوا تو اسی زمانے میں تصدق احمد خاں شیروانی تعلیم سے فارغ ہو کر انگلستان سے ہندوستان آئے۔ اور علی گڈھ میں بیرسٹری شروع کی۔ جو خوب چلی۔ اور جلد ہی وہ صفِ اوّل کے بیرسٹر سمجھے جانے لگے۔ اس زمانے میں مسجد مچھلی بازار کانپور کا واقع پیش آیا۔ انھوں نے اس کی قانونی پیروی بلا فیس کی۔ عام زمینداروں کے مقدمے تو ظاہر ہے کہ وہ پیشہ ورانہ طریقہ سے کرتے تھے لیکن اپنی برادری اور رشتہ داروں کے بڑے بڑے مقدمے بھی بلا فیس ہی کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ راقم الحروف سے فرخ آباد کے سجادہ نشین چھندن میاں مرحوم نے بیان کیا تھا۔ کہ انھوں نے اپنی درگاہ سے متعلق ایک سخت مقدمہ میں علی گڈھ سے تصدق احمد خاں کو فرخ آباد بلایا۔ بعد مقدمہ انھوں نے پچاس روپے شیروانی صاحب کی نذر کرنا چاہے لیکن انھوں نے اسے قبول نہیں کیا اور یہ کہکر واپس کر دیئے کہ اس رقم کو ان کی طرف سے درگاہ کا چندہ سمجھا جائے۔ تصدق احمد خاں بڑے لمبے چوڑے سرخ سفید اور وجیہہ شخصیت کے انسان تھے۔ ڈیل ڈول میں سر راس مسعود کیطرح تھے۔

علی گڈھ میں شیروانی صاحب کی پریکٹس خوب چلی جہاں وہ ججی کچہری پیچھے لال

خانی پٹھانوں کی ایک کوٹھی میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ جب کبھی دہلی جاتے تو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی نمبر۱ دریا گنج میں اور جب الہ آباد جاتے تو آنند بھون میں ٹھہرتے تھے۔

یہ زمانہ ہندوستان میں اور خاصکر مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور کشمکش کا زمانہ تھا۔ ایک عجیب طرح کا جوش خروش لوگوں کے دلوں میں بھرا تھا۔ جس کو الفاظ میں بیان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پہلی جنگ عظیم کے نتائج کے تحت ترکی پر آفات کا پہاڑ ٹوٹا۔ مسلمانانِ ہند ترکی کے معاملات میں اسقدر دلچسپی رکھتے تھے کہ انہیں وطن کے اضلاع اور صوبوں سے بھی اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ جذبات زیادہ تر اخوت اسلامی اور عالمگیر اسلامی برادری کی بنا پر تھے۔ لیکن ان کی تہ میں دبی ہوئی برطانیہ سے مخالفت کی آگ بھی تھی۔

برادرانِ وطن کیطرح تقسیم بنگالہ پر مسلمان آتش زیر پا نہیں ہوئے حالانکہ برطانیہ کی سیاسی چال کو وہ خوب سمجھتے تھے۔ اسمیں کچھ ان کا موہوم سا سیاسی فائدہ بھی تھا۔ اور قوم کی رہنمائی کی ڈور تمام کی تمام سرسید کی چھوڑی ہوئی علی گڑھ پارٹی کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لیئے تاحال قوم پرست مسلمان زیادہ عملی طاقت نہیں بن سکے تھے۔ لیکن علی برادران ظفر علی خاں حسرت موہانی اور ابوالکلام آزاد جیل خانوں سے اختتام جنگ پر ۱۹۲۰ء میں نکلے تو انہوں نے خلافت اور ترک موالات کی تحریک شروع کر دی۔ مسلمانوں کے قلوب ہندؤں کے ساتھ اتحاد اور برطانیہ کی مخالفت سے لبریز تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ترکی ہی مسلمانوں کی آخری طاقت دنیا میں رہ گئی ہے۔ اس کو اگر کچھ فائدہ پہنچانا ہے تو ہندوستان کے اتحاد سے ہی لندن کی حکومت پر زور ڈالا جاسکتا ہے۔

تحریک خلافت اور ترک موالات شروع ہونے پر گاندھی اور علی برادران

علی گڈھ آئے اور کالج کے طلباء سے کالج چھوڑ دینے کو کہا۔ علی گڈھ کالج کے طلباء نے کالج چھوڑ دیا۔

پرنسپل ڈاکٹر ضیاالدین اور ان کے ساتھی مہینہ دو مہینہ کیلئے کالج کو بند کر کے خانہ نشین ہو گئے۔ اور خفیہ طور سے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ طلباء کو انہوں نے حکم دیدیا کہ بورڈنگ ہاؤس خالی کر کے وہ اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔ آخر کار ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۰ء تک کوئی سوا سو لڑکے بورڈنگ ہاؤس میں رہ گئے۔ ڈاکٹر ضیا الدین نے ان کا کھانا پانی بند کر ہی رکھا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر ضیا الدین کی طلب پر علی گڈھ کی مسلح پولیس فورس کافی تعداد میں علی الصباح کالج کے احاطہ میں داخل ہوئی اور طلباء کو جبراً بورڈنگ ہاؤس سے نکالنا شروع کر دیا۔

مولانا محمد علی ان پر شورہ حالات کی وجہ سے اولڈ بوائز لاج میں مقیم تھے۔ اور ان کی امداد کیلئے تصدق احمد خاں اور عبد المجید خواجہ علی گڈھ میں موجود تھے۔ مولانا محمد علی کا خیال تھا کہ اس کالج کو نیشنل کالج بنا دیا جائے۔ اور وہ فوری طور سے کالج کے ٹرسٹیان سرکاری گرانٹ لینا بند کر دیں۔ اور ہم اپنے طریقہ پر تعلیم جاری رکھیں۔ ملک بھر میں پھیلے ہوئے سرکار پرست ٹرسٹیان بھلا یہ شرط کیوں قبول کر سکتے تھے۔ اسوقت سب کو یقین تھا کہ پولیس گولی چلائے گی۔ لیکن بالکل آخری لمحے میں مولانا محمد علی نے فیصلہ کیا کہ جو طلباء بورڈنگ ہاؤس میں ہیں۔ وہ ان کے ساتھ سڑک کی دوسری طرف کرایہ پر لی ہوئی کوٹھیوں میں چلے جائیں۔ اور دو ایک دن ہی میں کسی نہ کسی طرح انتظام کر کے مولانا محمد علی نے علی گڈھ کالج کی مسجد میں ہی حضرت شیخ الہند کو بلا کر ان کے مبارک ہاتھوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کرا دیا اور سب طلباء کے ساتھ خود بھی کرایہ کی عمارتوں میں اور نواب اسمٰعیل خاں کے میرٹھ سے بھیجے ہوئے خیموں میں رہنے لگے۔ مولانا محمد علی نے بیماری کی حالت میں اور علی گڈھ کی سخت

سردی کے دنوں میں یکم نومبر ۱۹۲۰ء کی رات محض کپڑے کے ایک معمولی شامیانہ کے نیچے گذاری جو ہر طرف سے کھلا ہوا تھا۔

اس تمام آزمائشی دور میں تصدق احمد خاں اور عبدالمجید خواجہ مولانا محمد علی کو چپ دراست سینہ پر بنے رہے۔ جب جامعہ ملیہ قائم ہو گئی تو تصدق احمد خاں اس کے انتظامی سکریٹری اور عبدالمجید خواجہ اس کے پرنسپل بنائے گئے۔ مولانا محمد علی خاں کوآپریشن کی تحریک کے سلسلہ میں بار بار باہر دوروں پر جاتے رہے۔ اور سب مقامی کام ان دونوں کے کاندھوں پر پڑ گیا۔ تصدق احمد خاں نے ان دنوں میں ایک دفعہ راقم الحروف سے کہا تھا کہ انہوں نے تحریک ترک موالات کی تفصیلات کی بعض خامیوں پر گاندھی جی نے بس یہی کہا: مسٹر شیروانی تم پیدائشی بیرسٹر ہو۔ تحریک کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے علی گڈھ کے چند وکیلوں اور بیرسٹروں کے ساتھ تصدق احمد خاں اور عبدالمجید خواجہ نے اپنے پیشہ کا کام چھوڑ دیا۔ اور اپنے ہمہ تن جامعہ کیلئے وقف ہو گئے۔ تصدق احمد خاں صوبہ یو پی خلافت کمیٹی کے سکریٹری بنائے گئے۔ ان کا دفتر ان دنوں میرٹھ میں تھا۔ اور اس وجہ سے ان کو بار بار میرٹھ جانا پڑتا۔ اور یو پی کے اضلاع کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔ انھوں روپیہ چندے کا انہوں نے جمع کیا۔ ہزاروں خلافت کے والنٹیر سرکاری قوانین توڑ توڑ کر جیل خانے بھیجے جانے لگے۔ انہیں دنوں میں ایک دفعہ ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں شیروانی صاحب نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ ابھی حال ہی میں جب وہ آنند بھون گئے تھے تو موتی لال جی نے ان سے کہا کہ بھئی شیروانی ذرا جواہر لال کو سمجھاؤ۔ یہ کیا واہیات ہے۔ گاندھی جی کے طریق زندگی پر عمل کرتے ہوئے جواہر لال نے اپنی اہلیہ کے گھر میں جانا بالکل ترک کر دیا ہے۔ ادھر میری بہو تو ابھی بالکل کم عمر ہے۔ بشیر علی صاحب نے راقم الحروف کو یہ بھی بتایا کہ اس واہیات خیال کو دور کرنے کیلئے اسی دن انہوں

نے جواہر لال سے خوب بحث کی عملاً اس کا نتیجہ نکلا اس کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا۔ انہیں دنوں میں یعنی سنہ ۳۰ء و سنہ ۳۱ء میں موضع اپر دل پور متصل سکندرراؤ ضلع علی گڑھ میں تصدق احمد خاں نے گاؤں کے کثیر مجمع میں سرکار کے خلاف ایک سخت تقریر کی اور ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ شیروانی صاحب علی گڑھ کے بے تاج کے بادشاہ تھے۔ اس لئے سرکار نے اپنی تمام کارروائیوں کو نہایت خفیہ رکھا تاکہ ان کو چھڑانے کیلئے لوگ کچہری یا جیل خانے پر دھاوا نہ بول دیں۔ اسی وجہ سے ان کی گرفتاری سماعتِ مقدمہ، گواہی، شہادت اور فیصلۂ مقدمہ سب ایک ہی دن میں ہو گیا۔ اور اسی رات کو آٹھ بجے ایک اسپیشل ٹرین سے علی گڑھ جیل کے پیچھے کے چور دروازے سے نکال کر سخت پہرے میں انہیں نینی جیل بھیج دیا گیا جو الہ آباد کے قریب ہے۔ مقدمے کی سماعت کرنے والے علی گڑھ کے کلکٹر زین الدین تھے جو سر سید کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اور علی گڑھ پارٹی کے ایک رکن تھے۔ سرکار کی طرف سے جرح کرنیوالا لکھنؤ کا مشہور بیرسٹر جیکسن تھا۔ سرکار کو گواہ اور شاہد بالکل نہ ملتے لیکن نواب مزمل خاں نے اپنے ملازمین اور کارندوں کو اس کارروائی کیلئے تیار کر لیا۔ حالانکہ یہ لوگ اس تقریر میں موجود نہیں تھے۔ زین الدین نے آپ کو ایک سال کی بامشقت سزا کا حکم سنایا۔ حکم سننے کے بعد کمرہ عدالت میں ہی شیروانی صاحب نے ایک چھوٹا سا پرچہ لکھ کر مجھے دیا کہ میں نواب مزمل کو دے آؤں۔ اس پرچہ پر شیروانی صاحب کا نام اور صرف یہ شعر لکھا تھا ؎

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

میں اس دن نواب صاحب کو علی گڑھ میں نہیں پا سکا اس لئے ایک لفافہ بند کر کے یہ پرچہ میں نے ان کو بذریعہ ڈاک بھیج دیا۔

پورے ایک سال شیروانی صاحب نینی جیل میں رہے۔ وہاں ان سے کاغذ
کے لفافے بنانے کا کام لیا جاتا تھا۔ جیل خانے سے نکلے تو جلد ہی ۱۹۲۲ء آگیا
اور تحریک خلافت دھیمی پڑ گئی۔ کیونکہ انگورہ میں مستقل جمہوری حکومت مصطفےٰ کمال پاشا
نے قائم کر لی تھی۔ اور ترکوں نے یونانیوں کو شہر سمرنا اور ساحلِ ایشیائے کوچک سے
نکال بھگایا۔ عصمت انونو نے بڑی پامردی سے کام لیا تھا۔ وارسائی صلح نامہ کے
وقت لارڈ کرزن کی دھمکیوں کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ اور اپنے قومی مطالبات پورے
ہو گئے اور برطانیہ یونانیوں کی جنگی امداد کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اب مسلمانانِ
ہند کے دلوں سے ترک کی حمایت کا وہ زور شور قدرتاً کم ہو گیا۔ ادھر دو چار بڑی
بڑی طاقتیں خلافت والوں کے مقابلے میں صف بستہ تھیں۔ اودھ اور یو پی کے
زمینداروں اور خلافت والوں سے ہمیشہ سے سخت ناراض تھے کیونکہ
اس تحریک نے ان کے مقامی اثر کو بالکل غارت کر دیا تھا۔ اور برطانوی حکومت
ان کو بے اثر دیکھنے کیلئے کبھی تیار نہیں تھی۔ دوسری یہ بات کہ لاہور کے سر شفیع
اور پشاور کے سر عبد القیوم سخت سرکاری آدمی ہونیکی وجہ سے اس تحریک کے
سخت خلاف تھے۔ تیسری بات یہ ہوئی کہ خود علی برادران اور زعمائے خلافت کو
پبلک فنڈ کے رکھنے اور برتنے کا بھی تجربہ نہیں تھا۔ انہوں نے خلافت کا
روپیہ اپنے صدر حاجی جان چھوٹانی کے پاس رکھ چھوڑا تھا جب تک لاکھوں آتے
گئے اور خرچ ہوتے گئے۔ اسوقت تک تو کچھ پتہ نہ چلا جب تحریک دھیمی پڑنے
لگی تو خلافت کا سوا لاکھ روپیہ سیٹھ چھوٹانی کی تحویل میں تھا سیٹھ صاحب نے اپنے دیوالیہ
ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نہایت نامناسب بدانتظامی سے تحریک خلافت کو سخت
دھکا لگا۔ اور جتنے ان کے دشمن لگے بیٹھے تھے۔ ایک دفعہ سب کے سب سامنے
آ گئے ایماندار سے ایماندار آدمی پر غبن کے حملے کرنے لگے۔ علی برادران

صفائی دیتے تھے اور کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام
آزاد اور تصدق احمد خاں اور ان جیسے اور بہت سے جن کا اس فنڈ سے کچھ تعلق نہ تھا
تحریک خلافت سے علیحدہ ہو گئے اور اسکا اعلان بھی کر دیا۔ مصطفےٰ کمال خود بھی خلافت
کا خاتمہ کر چکے تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کا جوش تحریک خلافت کی طرف سے بالکل سرد
پڑ چکا تھا۔ علی برادران تا دیر اس لیکر کو پیٹتے رہے۔ لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں
کانگریس دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ اسمبلی اور کونسلوں میں جاکر حکومت
کے کاموں میں بادھا ڈالنا چاہیئے۔ اور دوسرا گروہ اس حکومت کے ساتھ تعاون
سمجھتا تھا۔ اور اس کے خلاف تھا۔ پہلی پارٹی جو کونسل اور اسمبلی میں جانیکی حامی تھی سوراج
پارٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسمیں سی۔ آر داس اور موتی لال جیسے لیڈر تھے۔
تصدق احمد خاں شیروانی ابھی انہیں کے ساتھ تھے۔ شاید ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء کا
کام الیکشن تھا جس میں تصدق احمد خاں کا کام کرنے کیلئے۔ راقم الحروف ایک ماہ شہر
میرٹھ میں مقیم رہا۔ آپ کے مقابلے پر وہاں کے رئیس اعظم شیخ وحیدالدین تھے شہر
میرٹھ میں شیروانی صاحب کیلئے مجھے ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی۔ ان کی سیاسی شہرت
اسقدر تھی کہ لوگ بہ آسانی ان کیلئے حامی بھر لیتے تھے۔ اور ان کے دورے نے تو اس
شہر کی فضا بالکل ہی ہموار کر دی تھی۔ ان کے بلند و بالا سرخ و سفید رنگ کو دیکھ کر لوگ بلا
دلیل ان کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ آخر کو خاص الیکشن کے دن صبح چھ یا سات بجے شیخ
وحیدالدین نے اپنا نام واپس لے لیا۔ اور شیروانی صاحب بلا مقابلہ ملک کی سنٹرل اسمبلی
دہلی کے ممبر بن گئے۔ اس کے بعد الیکشن اور بھی آپ نے اسی طرح جیتا۔ ایک مرتبہ
ایسا موقع آیا کہ اسمبلی کی صدارت کے لئے سوراج پارٹی کیطرف سے آپکا نام سر عبدالرحیم
کیلئے پیش کیا گیا۔ اسمبلی میں سوراج پارٹی کی اکثریت تو نہیں لیکن لڑائی کی فضا
قائم رکھنے کیلئے اچھی خاصی تعداد تھی۔ رائے شماری پر ظاہر ہوا کہ تصدق احمد خاں
شیروانی صرف ۸ ووٹ سے ہارے

تاریخی چارٹ جلیل القدر علماءِ کرام کی نظر میں

حضرت شیخ الحدیث مظاہر العلوم مدظلہٗ کا ارشاد گرامی

"اپنے بزرگوں کے ناموں کو بڑے شوق سے پڑھا"

برخوردار تمہارا چارٹ پہنچا میں تین سال سے آنکھوں میں پانی اترنے کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہوں۔ پھر بھی آتشی شیشے کی مدد سے جس سے حروف موٹے نظر آتے ہیں شوق سے تمہارے چارٹ کو دیکھا۔ اور بزرگان دین کے نام پڑھے جن کو میں جانتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ تمہاری اس سعی کو تمہارے لئے توشۂ آخرت بنائے۔

دعاگو محمد زکریا

جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین کے چارٹ پر شیخ التفسیر جامعہ ملیہ کی رائے

جناب قاضی زین العابدین صاحب شیخ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اپنے ایک مخصوص پیغام میں تحریر فرمایا: "آپ نے جس انداز فکر کے تحت اس چارٹ کو ترتیب دیا ہے اس پر آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں میری رائے میں اس چارٹ کو نہ صرف گھروں میں بلکہ ہر مدرسہ، لائبریری اور ہر دینی ادارہ میں آویزاں کیا جانا چاہیے اور ہر سال ہزاروں کی تعداد میں اسکی اشاعت ہونی چاہیے۔ آج جبکہ غیر مسلم تو کیا خود تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی یہ نہیں معلوم کہ ماضی میں مسلمان مجاہدین نے کیا کیا قربانیاں دی ہیں تو جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین جیسے چارٹ کی ضرورت اور بھی شدید محسوس ہوتی ہے آپ نے جس کام کو انجام دیا ہے اس پر پوری ملت اسلامیہ کو شکر گزار ہونا چاہیے"

جناب مولانا سید محمد اظہر قیصر کاشمیری

مدیر دارالعلوم دیوبند اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں

"آپ کا تاریخی چارٹ پہنچا۔ دارالعلوم دیوبند میں سب دیکھنے والوں نے اسکی تعریف کی ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ کو جس نئے ڈھنگ سے آپ نے پیش کیا ہے وہ آپ ہی کا حق ہے آپ تاریخی چارٹ بنانے میں ماہر ہیں اللہ تعالےٰ آپکی سعی کو قبول فرمائے"
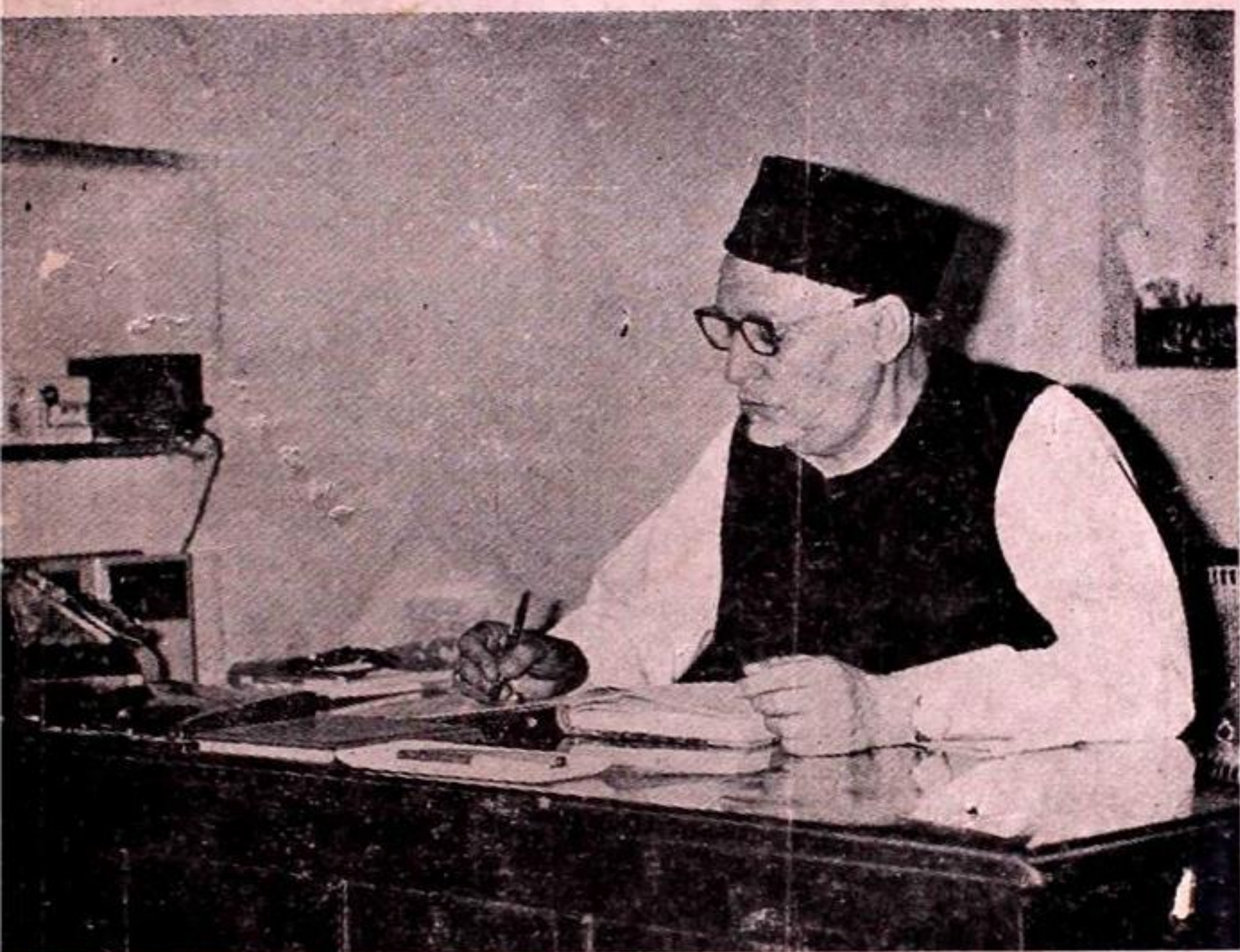
مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی ثم دہلوی کتاب کی تصنیف میں مصرو

عطا اسلاف کا سوزِ دروں کر

شریکِ زُمرۂ لَا یَحزَنُوں کر

خِرد کی گُتھیاں سُلجھا چکا میں

مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر